راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 25 واں سال

MONTHLY Arzang LAHORE

ماہنامہ

ارژنگ لاہور

جنوری ۲۰۲۴ء

مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی

مدیران:
حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

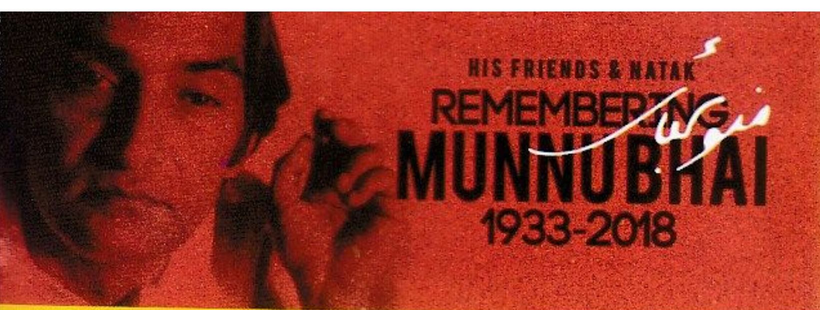

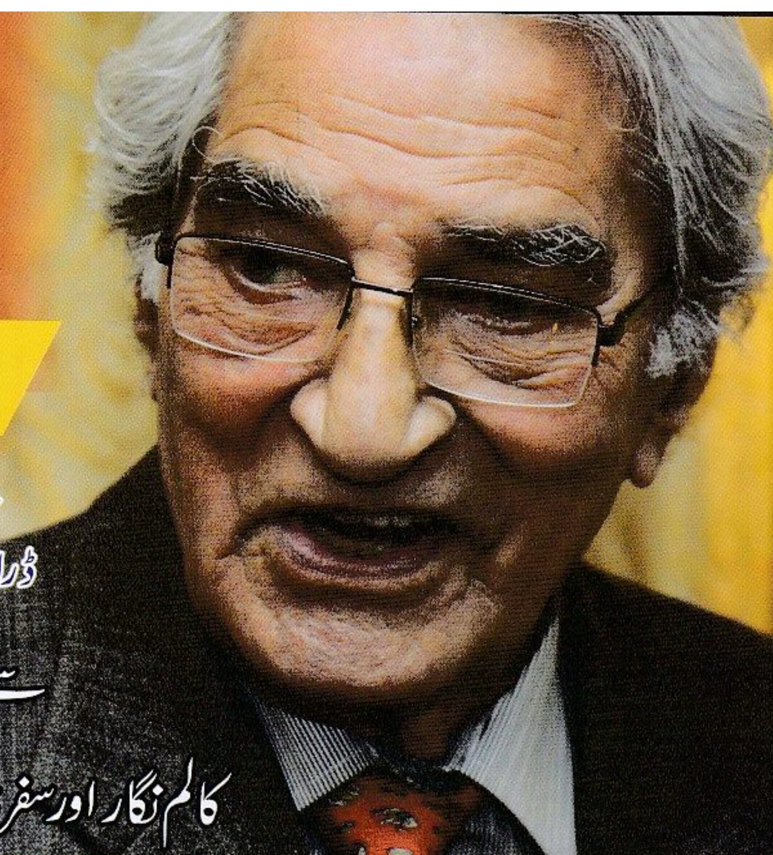

کالم نگار کے لیے غیر جانب داری ممکن نہیں ہے

عہد ساز صحافی،
ڈرامہ نویس اور شاعر

مُنّو بھائی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرنے والا ہر لکھاری ترقی پسند ہے: منو بھائی

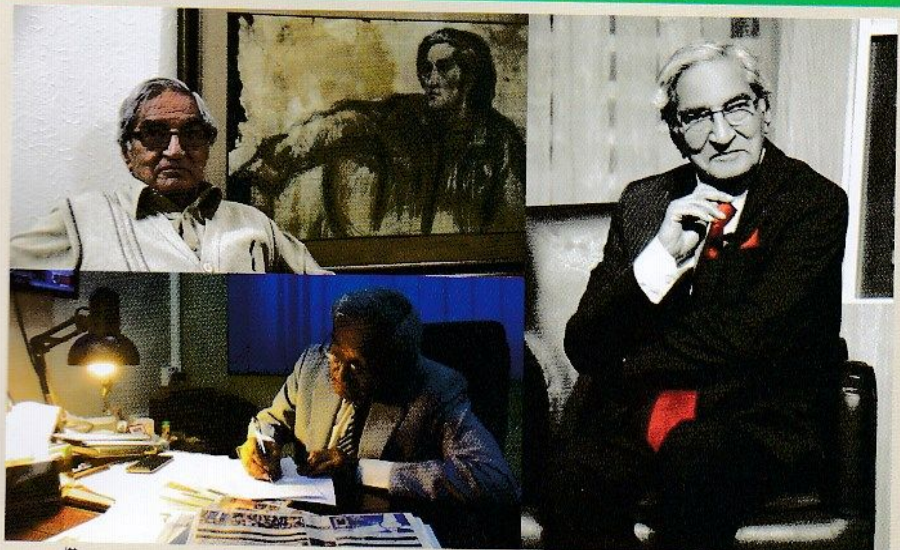

بیادِ مُنّو بھائی

انیس جنوری منو بھائی کی برسی کا دن ہے۔

وزیرآباد میں پیدا ہونے والا عہد ساز صحافی، رجحان ساز ڈرامہ نویس، خوش نوا شاعر اور ترقی پسند مصنف ایک بامقصد اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار کر چھ سال پہلے اسی روز دیارِ عدم روانہ ہوئے۔ منو بھائی سے جب کوئی ان کا سن پیدائش پوچھتا تو مذاقاً ہٹلر کے جرمنی میں

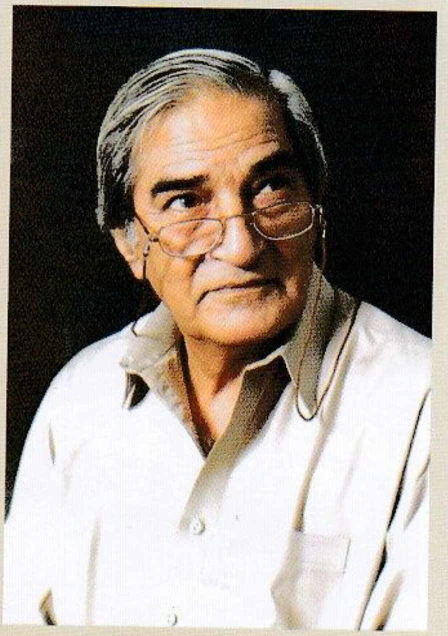

برسرِاقتدار آنے کے واقعے کو ساتھ ملا کر 1933 ء بتایا کرتے تھے۔ جس منیر احمد قریشی کا نام احمد ندیم قاسمی نے منو بھائی رکھا تھا، وہ چھ دہائیاں صحافت میں بھرپور طریقے سے سرگرم عمل رہے مگر ان کے بدترین مخالف بھی ان کی دیانت کی گواہی دیتے تھے۔ نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی کہنے پر مجبور تھے کہ اس شخص نے کبھی اپنے نظریات کی قیمت وصول نہیں کی، قلم کی خدمت کو پامال ہونے نہیں دیا۔ تمام زندگی انہوں نے اپنے قلم کو غریبوں کے حقوق اور کمزوروں کی حمایت کے لیے استعمال کیا۔ بے کسوں، مسکینوں اور لاچار و نادار لوگوں سے ان کی خصوصی محبت تھی۔ تمام زندگی اس مجبور و محکوم طبقے کے لیے وہ قلمی جہاد کرتے رہے۔ میری خوش قسمتی کہ میرا ان کی صحبت میں کافی وقت گزرا۔ ان کے ساتھ عقیدت مندی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے شروع ہو گیا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں ایک دن میں نے اور ابرار ندیم نے منو بھائی کے گھر ان کی بیگم کی موجودگی میں ان کا انٹرویو کیا جو کہ ماہنامہ ارژنگ میں شائع ہوا۔ ان کی برسی کی نسبت سے ان کا انٹرویو دوبارہ شائع کرنے کا مقصد خراجِ تحسین پیش کرنا ہے اور قارئین کو یاد دہانی کرانا کہ ایسے بلند کردار بھی اہلِ قلم گزرے ہیں۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

جنوری 2024 شمارہ 1

مدیرِ اعلیٰ

- عامر بن علی

مدیران

- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت

- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت

- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹو گرافر: نعمان حسن 0333-4918383

سرورق: عمران شناور 0321-4740421

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ' 2

مضامین:

- قائد اعظم میں کیا کرشمہ تھا / جمیل یوسف ' 4
- اقبال اور بابر / ڈاکٹر جاوید اقبال ' 10
- کہانی تھک کر سوگئی ہے / اصغر ندیم سیّد 12
- جسٹس (ر) میاں نذیر اختر۔ ایک ہمہ جہتی تخلیقی شخصیت / نسیم سحر ' 14
- ترکی کا امیر البحر سیّدی علی رئیس / مرزا کاظم بیگ ' 15
- باغی شاعر۔ جون ایلیا / ظفر سیّد ' 17
- حالات کی دہلیز پہ / عبدالوحید بسمل ' 22
- دی فادر، دی سن اینڈ دی ہولی گھوسٹ: ایک تعارف / ڈاکٹر عادل سعید قریشی 26
- اردو غزل اٹھارویں اور انیسویں صدی میں / لبنیٰ صفدر ' 28
- ڈاکٹر عابد حسنین سیال کی شاعری پر ایک نظر / سیّدہ حمیرا ارباب بخاری ' 30

شعری گوشے: شاعر علی شاعر، تاثیر نقوی، نواب ناظم، شاذیہ باب، قندیل بدر 30 تا 35

طنز و مزاح: ○ فائیو اسٹار ہوٹل کے ''فضائل'' / عطاء الحق قاسمی ' 36

- دوستی اور غبارے / حسین احمد شیرازی ' 37

افسانے: ○ شیشہ اور سنگ / سیما پیروز ' 40

- دیوار کے اُس پار / انجینئر ظفر محی الدین ' 46

انٹرویو: منو بھائی ' 48

انٹرویو: ولی عالم شاہین ' 50

- شاعری ' 51 تا 53

کالم: سالِ نو اور جاپان / عامر بن علی ' 54

- مختصر ادبی خبریں ' 55

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد

ساری تعریفوں کے لائق ہے وہ رب العالمیں
جس کی رحمت کے سمندر کا کنارا ہی نہیں
اس جہاں میں بھی وہی ہر ایک کا ہے کارساز
مالکِ روزِ جزا بھی ہے وہی جان آفریں
ہم فقط تیری ہی کرتے ہیں عبادت اے خدا!
اور تجھ ہی کو سمجھتے ہیں مددگار و معیں
اپنے ان بندوں کا سیدھا راستہ ہم کو دکھا
جن پہ خوش تھا، جن پہ تیری نعمتیں ہوتی رہیں
دور رکھ ان سے جو ہیں قہر وغضب میں مبتلا
اور ان سے جن کو بھٹکاتا ہے شیطانِ لعیں
اس ظہورِ بے نوا کی یہ دعا مقبول ہو
تو ہی سنتا ہے دُعائیں یا الٰہ العالمیں

حافظ محمد ظہور الحق ظہور

ذرّے ذرّے میں ترے نور کا جلوہ دیکھوں
دونوں عالم میں تری ذات کو یکتا دیکھوں
تیرا ہمسر نہ کوئی اور نہ ثانی ہے ترا
میں ازل سے ہی تجھے واحد و تنہا دیکھوں
فہم و ادراک سے آگے ہے کہیں تیرا مقام
میں تو خود کو کسی ذرّے سے بھی چھوٹا دیکھوں
بحر و بر، دشت و جبل، شمس و قمر، شام وسحر
جابجا میں تری قدرت کا حوالہ دیکھوں
باد و باراں، گل و گلزار، شجر رنگ و مہک
میں تو سب کو تیری عظمت سے شناسا دیکھوں
کون کہتا ہے کہ تو حاضر و موجود نہیں
پاس اپنے میں تجھے لمحہ بہ لمحہ دیکھوں
سارے موسم ہیں تری قدرتِ کامل کی دلیل
میں بہر رنگ ترا جلوۂ زیبا دیکھوں
اب تو آثم کی یہی ایک دعا ہے، یارب!
روزِ محشر تری بخشش کا اُجالا دیکھوں

آثم فردوسی

جھکی ہے کس کے تصور میں یہ جبینِ سجود
ہے کون جس کا تخیل میں ہو گیا ہے ورود
نفس نفس میں سمایا ہوا ہے اپنے کون؟
دل و دماغ پہ چھایا ہوا ہے کس کا وجود
یہ انجمن میں ہے کس کی ضیاء سے تابانی؟
یہ کس کے حُسن کی ضو ہے شریکِ بزم شہود
یہ چاندنی، یہ شفق یہ بہار لالہ و گل
ہے کس کا جلوۂ قدرت تمام ہست و بود
زباں سے کس کی ثنا روز و شب نکلتی ہے
جبین شوق ہے کس کے حضور محو سجود
وہی کہ جس کی ثناء لا الٰہ الا اللہ
وہی کہ جس کی صفت آبرو ہوا لموجود

شعیب آبرو

یہ کائناتِ رنگ و بو دراصل ہے پردا ترا
ہر شے ہے یاں تیری ثنا ہر نقش ہے جلوا ترا
یاں آگہی مجبور ہے ادراک بھی معذور ہے
کیا عقل کی ہو دسترس ہر انس و جاں بندا ترا
کیا ہے بساط آدمی اور کیا حصارِ نطق ہے
ہو کس طرح سے حق ادا اے خالقِ یکتا ترا
تو ہے جمیل و محترم، تو ہے جلیل و محتشم
جس نے بھی تجھ کو پا لیا، وہ ہو گیا شیدا ترا
تو قادر و قیوم ہے تیرے کرم کی دھوم ہے
تو نازشِ تخلیق ہے بے مثل ہے چہرا ترا
مستور تو ظاہر بھی تو موجود تو معبود تو
ہر سمت ہے پھیلا ہوا حُسنِ جہاں آرا ترا
تو خالق و مسجود ہے، مخلوق کا مقصود ہے
ہر دل میں تیری آرزو، ہر سر میں ہے سودا ترا
تو حی لایموت ہے دانائے ہست و بود ہے
تیرے لیے ہے ہر زماں اور ہر مکاں ذرا ترا
صرف اک دلِ اختر ہی کیا، ہر دل ہے تیری جلوہ گا
وہ کون سی محفل ہے یاں جس میں نہیں چرچا ترا

اختر حسین اختر

اگر یہ حسن چمن دامن بہار میں ہے
بہار بھی تو مگر تیرے اختیار میں ہے
تو خالق جز وکل بھی جہاں کا رازق بھی
یہ زندگی بھی ترے ہی نظام کار میں ہے
ہے تو ہی قائم و دائم کہ ہے ثبات تجھے
یہ آدمی تو فقط بزم انتشار میں ہے
وہ تیری شان ہے ارفع کہ دم بخود ہے نگاہ
وجود اپنا مگر عالم غبار میں ہے
جو تیرا لطف نہ ہو زندگی میں کیف کہاں
کہ زندگی کا ہر اک کیف تیرے پیار میں ہے
ترے جلال سے لرزاں جگر پہاڑوں کے
سمندروں کا یہ ہنگامہ کس شمار میں ہے
یہ تیری دین ہے داتا کہ حسن اختر و ماہ
برنگ صبح چمن میرے قلب زار میں ہے

اختر ہوشیار پوری

نعت

ہو کیسے بیاں مجھ سے تری شان مکمل
دیکھا نہ سنا تجھ سا تو انسان مکمل
تو فقر میں یکتا ہے تو شاہی میں بھی یکتا
درویش مکمل ہے تو سلطان مکمل
کہتے ہیں کہ جاں ہو تو زباں ہوتی ہے لیکن
بولے ہیں ترے کہنے پہ بے جان مکمل
ہو مجھ کو زیارت کبھی اے کاش کہ دیکھوں
میں ایک نظر میں کبھی قرآن مکمل
دل کے سبھی اوراق پہ لکھنا ہے ترا نام
کرنا ہے مجھے یوں بھی یہ دیوان مکمل
توحید کا اقرار تو بنیاد ہے اکرم
اقرارِ نبوت سے ہے ایمان مکمل

اکرم ناصر

اک نگر ہے جس کے سارے در دریچے سبز ہیں
مشکبو گلنار شامیں ہیں سویرے سبز ہیں
سب اُفق حدِ نظر تک نور میں ڈوبے ہوئے
جتنے منظر ذہن میں آتے ہیں گہرے سبز ہیں
کیا بجھی بیتی رُتیں کیا آنے والی ساعتیں
کیا گزرتے روز و شب تینوں زمانے سبز ہیں
جن سے گزرے تھے کبھی اُن موسموں کے قافلے
آج تک آباد ہیں اب تک وہ رستے سبز ہیں
تیرے ہر ذرّے پہ ہے اُس سبز گنبد کی نظر
سرزمینِ شوق تیرے سب حوالے سب ہیں
کیا خبر اے دل بلالیں حوض پر اُس دن جہاں
سبز رنگت آبخوروں کی پیالے سبز ہیں
فیض ہے صلِ علیٰ کیا ابرِ رحمت کا بشیر
آبجوئے زیست کے دونوں کنارے سبز ہیں

بشیر احمد بشیر

اک عجب کیف مدینے کی فضا دیتی ہے
میری ہر سانس کو خوشبو میں بسا دیتی ہے
ایک خوش رنگ کسک رہتی ہے جاں پر طاری
تلخئ ہجر بھی دوری میں مزہ دیتی ہے
جب بھی آتی ہے تصور میں مقدس وادی
نغمہ شوق کی لے اور بڑھا دیتی ہے
انؐ کی سیرت ہمیں دیتی ہے محبت کا پیام
انؐ کی تعلیم ہمیں درسِ وفا دیتی ہے
ایسی بھی آئی ہے فرقت میں کئی بار گھڑی
جو نگاہوں سے حجابات اُٹھا دیتی ہے
جب بھی کرتا ہوں میں تحریر فضائل اُنؐ کے
انؐ کی مدحت مجھے انداز نیا دیتی ہے
داد دیتے ہیں مجھے اہلِ محبت حافظ
شعر پڑھ کر مجھے مخلوق دعا دیتی ہے

حافظ لدھیانوی

نجم و شمس و قمر سے آگے بھی
اک سفر ہے سفر سے آگے بھی
آپؐ کا سنگِ در ہی دیکھا ہے
آپؐ کے سنگِ در سے آگے بھی
ہر طرف ہے حضورؐ کی رحمت
ہر طرف بحر و بر سے آگے بھی
عرض یہ ہے کہ آپؐ تو آقاؐ
جانتے ہیں خبر سے آگے بھی
شوقِ پرواز لے کے جاتا ہے
قدرت بال و پر سے آگے بھی
سدرۃ المنتہیٰ تو کچھ بھی نہیں
نورِ احمدؐ اُدھر سے آگے بھی
وصفِ نعتِ رسولؐ ہے باقی
شاعری کے ہنر سے آگے بھی

باقی احمد پوری

درسِ محبت دینے آیا درسِ محبت دے کے گیا
کیا کیا نعمت لے کر آیا کیا کیا نعمت دے کے گیا
نیرِ اعظم بن کر چمکا خاک کے اک اک ذرّے پر
دل والوں کو گرمی وحدت سوز و حرارت دے کے گیا
جو کچھ تیرے منہ سے نکلا اصل میں ہے قرآن وہی
اور لوحِ محفوظ وہی ہے تو جو دولت دے کے گیا
تیرے فیض سے خاک نشیں بھی اوجِ ثریا تک پہنچے
جاہل گلہ بانوں کو تو نورِ بصیرت دے کے گیا
کون ہے جس نے دنیا کو اخلاق کا زیور پہنایا
کون ہے جو انسانوں کو آئینِ شرافت دے کے گیا
ختمِ رُسل کے رُتبے کا عرفان کسے ہو سکتا ہے؟
جو ہر فرش کی پستی کو جو عرش کی رفعت دے کے گیا

جوہر نظامی

ہم سوئے حشر چلیں گے شہِ ابرار کے ساتھ
قافلہ ہوگا رواں قافلہ سالار کے ساتھ
مدحتِ خواجہ دیں، مدحتِ سرکار کے ساتھ
عمر گزری مری کیفیت سرشار کے ساتھ
یہ تو طیبہ کی محبت کا اثر ہے ورنہ
کون روتا ہے لپٹ کر در و دیوار کے ساتھ
رہ گئے منزلِ سدرہ پہ پہنچ کر جبریل
چل نہیں سکتا فرشتہ تری رفتار کے ساتھ
پُل سے مجھ سا بھی گنہگار گزر جائے گا
ہوگی سرکار کی رحمت جو گنہگار کے ساتھ
گر مدینے کا تصور ہے تو ظلمت کیسی
ربط مضبوط رہے عالمِ انوار کے ساتھ
ہم بھی مظہر سے سنیں گے کوئی نعتِ رنگیں
گر ملاقات ہوئی شاعرِ دربار کے ساتھ

حافظ مظہر الدین

قائداعظم میں کیا کرشمہ تھا

جمیل یوسف

برصغیر کے مسلمانوں کو جو بے پایاں عقیدت اور جو بے پناہ محبت اپنے محبوب قائد حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ساتھ تھی اس کی مثال تاریخ عالم میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ جو لوگ کراچی میں قائداعظمؒ کی نماز جنازہ میں شریک تھے، وہ بتاتے ہیں کہ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کا ایک سمندر تھا جو حدِ نگاہ تک موجزن تھا، لاکھوں لوگ، بچے بوڑھے اور جوان یوں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی زندگی کا سہارا اس سے چھین لیا گیا ہو۔ پورے ملک میں، خیبر سے لے کر چٹاگانگ بلکہ کاکسس بازار تک اسی طرح کے مناظر دیکھنے میں آ رہے تھے جس نے یہ خبر سنی، دم بخود ہو کر رہ گیا جیسے کسی نے اسے کوئی ضرب کاری لگا دی ہو، ہر کوئی غم سے نڈھال تھا، ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ہر زبان پر یہی سوال تھا کہ اب کیا ہوگا؟ اپنے مضمون ''امیر کارواں'' (مطبوعہ ماہِ نو۔ قائداعظم نمبر) میں جناب شعیب قریشی اپنے ذاتی مشاہدے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک غریب ان پڑھ کشمیری بچہ اپنے ماں باپ کھو کر اور سب کچھ لٹا کر صرف اپنی جان عزیز کے ساتھ بہ مشکل کراچی پہنچا تھا اور ایک مہاجر مسلمان گھرانے میں رہتا تھا۔ صبح کو جب دفعتاً قائداعظمؒ کے انتقال کی المناک خبر شہر میں بجلی کی طرح گشت کر رہی تھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا اور کہتا تھا ''اب ہم کشمیریوں اور ہمارے کشمیر کو کون بچائے گا۔''

جناب ممتاز حسن لکھتے ہیں کہ 1948ء میں جب قائداعظمؒ بیمار تھے اور زیارت میں قیام پذیر تھے، مجھے اپنے گاؤں جانے کا اتفاق ہوا تو گاؤں کے مرد عورتیں اور بچے آ کر مجھ سے ان کی صحت کے بارے میں استفسار کرنے لگے۔ ''بابے دا ہُن کی حال اے'' ''سانوں دسو بابے دا، ساڈے لئی کی حکم اے'' ان لوگوں کو قائداعظمؒ کا پورا نام بھی معلوم نہیں تھا صرف یہ معلوم تھا کہ ان کا ملجا و ماوا ایک ایسا شخص دنیا میں موجود ہے جس کی زندگی ان کے لئے وقف ہے۔ وہ رات دن اپنے بابے کی صحت کے لئے دعا کر رہے تھے۔ وہ ان کا تھا اور وہ اس کے۔

لوگ اپنے محبوب قائد سے کس قدر محبت کرتے تھے اور کس طرح دل و جان سے ان پر فدا تھے اس کا کچھ اندازہ جناب ممتاز حسن کے بیان کئے ہوئے ایک اور واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

''عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے مجھے اس کا اندازہ 1946ء میں ہوا جب جناح لندن کے مشرقی حصے میں واقع ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں کی صفیں خالی کر دیں تا کہ وہ سب سے آگے کی صف میں بیٹھ سکیں۔ اگرچہ خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں اور کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ قائداعظمؒ کو قریب سے دیکھنا اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے میرے خدا میری زندگی محمد علی جناحؒ کو بخش دے۔ یہ سارے کا سارا مجمع غریب اور نادار مسلمانوں کا تھا، کوئی مزدور تھا، کوئی ملاح تھا، کوئی چھوٹا موٹا دوکاندار، کوئی خوانچہ فروش۔ جناح نے نماز کے لئے یہ مسجد خوب منتخب کی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔''

بیگم تصدق حسین کا بیان ہے کہ ایک دن کا ذکر ہے قائداعظمؒ لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ پرآشوب زمانہ بہت کرب انگیز تھا۔ حکومت برطانیہ مسلمانوں کو دبانے اور پاکستان کے مطالبے کو پس پشت ڈالنے کے لئے طرح طرح کی سختیاں کر رہی تھی۔ قائداعظمؒ کے لاہور آنے کی خبر نے ہمارے پژمردہ دلوں میں تازگی پیدا کر دی۔ ہر شخص ان کی تشریف آوری کی خوشی سے سرشار تھا۔ اچانک شام چھ بجے یہ سنسنی خیز خبر پہنچی کہ کسی نے قائداعظمؒ پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا ہے۔ میں اس وقت اندرون شہر ایک میٹنگ میں شریک تھی۔ خبر پہنچتے ہی میٹنگ فوراً درہم برہم ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگوں نے سنتے ہی دکانیں بند کر دیں، بارونق بازار فوراً خاموش اور سنسان ہو گئے۔ لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں ممدوٹ ولا کی طرف رواں تھیں۔ سڑکوں پر موٹروں اور تانگوں کا چلنا دشوار ہو گیا، جو سنتا وہیں سب کام چھوڑ کر ساتھ ہو لیتا۔ چند لمحوں میں ممدوٹ ولا کے دروازے پر بے پناہ بھیڑ لگ گئی اور قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ اندر کوٹھی میں شہر کے ہر حصے سے ہزاروں ٹیلیفون آ رہے تھے۔

قائداعظمؒ کے سیکرٹری، ہجوم کا شور سن کر باہر نکل آئے اور لوگوں کو بتایا کہ قائداعظمؒ بخیریت ہیں۔ انہیں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا مگر سیکرٹری کی بات کون سنتا تھا، لوگوں کا مطالبہ تھا کہ ہمیں قائداعظم دکھاؤ۔ وہ کہاں ہیں؟ انہیں کس موذی نے زخمی کیا ہے؟ ہمیں بتاؤ وہ شقی القلب کون ہے۔ سیکرٹری کافی دیر تک ہجوم کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا مگر لوگوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ ہجوم لحہ بہ لحہ اور بے تاب ہو رہا تھا۔ قائداعظمؒ

کی صورت دیکھنے کے لئے ہر شخص بے چین تھا۔ جب مجمع بالکل قابو سے باہر ہو گیا اور اس کی آوازیں اندر پہنچنے لگیں تو قائداعظم کا دل اپنے فدائی مسلمانوں کی محبت دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ وہ باہر نکل آئے اور برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر فرمایا ''میرے بھائیو! میں بالکل اچھا ہوں مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ محمد علی کے ساتھ خدا کی مدد شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو پاکستان بنانا مقصود ہے۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تمہیں بے چین کرنے کے لئے یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہے، میں تمہاری محبت کا بہت شکر گزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہاری یہ محبت پاکستان کی محبت میں تبدیل ہو جائے۔''

قائداعظمؒ سے عام مسلمانوں کو جو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اور جس طرح وہ ان کے ایک اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے لئے کمربستہ ہوگئے تھے اسی سے پاکستان کا حصول ممکن ہوا۔ اس صورتحال سے انگریزوں اور کانگریسی لیڈروں کو اچھی طرح آگاہی تھی۔ اپنی کتاب ورڈکٹ آف انڈیا (Verdict of India) میں بیورلے نکلز قائداعظم کے بارے میں لکھتا ہے ''وہ اپنے ایک اشارے سے اپنی مرضی کے مطابق جنگ کا رخ پلٹ سکتے ہیں۔ دس کروڑ مسلمان ان کے ایک اشارے پر دائیں بائیں اور آگے پیچھے بڑھ سکتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ ان کے حکم کے علاوہ کسی اور کا حکم ماننے کو تیار نہیں ہیں۔''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر قائداعظم محمد علی جناحؒ کی شخصیت اور ان کے کردار میں ایسا کیا کرشمہ تھا کہ گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے باقی سارے مسلمان اپنے گروہی اور علاقائی اختلافات کو بھلا کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح قائداعظم کے پرچم تلے کھڑے ہوئے تھے۔ کیا قائداعظم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے انہیں اس قدر قائل کر لیا تھا؟ کیا انہوں نے کوئی ایسی زبان استعمال کی تھی جو عام لوگ آسانی سے سمجھ لیتے تھے؟ کیا انہوں نے روپے پیسے، پلاٹوں پرمٹوں، ملازمتوں اور عہدوں کا لالچ دے کر لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا؟ کیا انہوں نے روٹی کپڑوں اور مکان کا نعرہ بلند کیا تھا؟ آخر وہ کون سی قوت تھی جس کے بل بوتے پر قائداعظم نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا؟ دنیا کے نقشے کو تبدیل کر دیا۔ تاریخ کا وہ معجزہ رونما ہو گیا جس کا نام پاکستان ہے۔ دنیا کی وہ سپر پاور جس کی عالمگیر حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اپنے تمام وسائل کے باوجود قائداعظم کے عزم کو پابہ زنجیر نہ کر سکی۔ تحریک پاکستان کے بے پناہ سیلاب کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی۔ نہرو خاندان کے چہیتے اور شیدائی اور ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قیام پاکستان کے کئی برس بعد بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا ''مجھے صرف اس مقصد کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا کہ میں ہندوستان کو کسی نہ کسی طریقہ سے متحد رکھ سکوں اور ایک متحدہ ہندوستان ہی کو اقتدار منتقل کروں۔ میں نے اس مقصد کے لئے بڑی کوششیں کیں۔ دن رات ایک کر دیئے۔ راتوں کی نیند حرام کی، لیکن میرے مقصد کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنا رہا اور وہ تھا محمد علی جناح۔''

ہندوستان کے تیس کروڑ ہندو اور ان کی منظم اور مضبوط سیاسی جماعت انڈین نیشنل کانگریس مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے بے شمار وسائل کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو نہ روک سکے۔ گاندھی نے کہا تھا قرارداد پاکستان ایک پاپ ہے، یہ ہماری دھرتی ہماری گاؤ ماتا کو چیرنے پھاڑنے کی سکیم ہے، ہم ایسا کبھی نہیں ہونے دیں گے، وہ گاندھی جسے ہندو اپنا مہاتما کہتے تھے اور اوتار سمجھتے تھے اور مہاتما بدھ کے بعد ہندوستان کی عظیم ترین ہستی گردانتے ہیں، اپنی تمام تر مشہور کردہ ''روحانی قوت'' کے باوجود قائداعظمؒ سے شکست کھا گیا۔ قیام پاکستان کے اعلان سے ہندوؤں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ قائداعظمؒ کی عظمت اور طاقت کا اندازہ ان الفاظ سے لگایئے جو پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت نے اس موقع پر کہے۔

''اگر مسلم لیگ کے پاس ایک سو گاندھی، ایک سو نہرو اور ایک سو پٹیل اور ایک سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور کانگریس کے پاس صرف ایک جناح ہوتا تو پاکستان کبھی معرض وجود میں نہ آتا۔'' یعنی وجے لکشمی پنڈت یہ کہہ رہی ہیں کہ ایک گاندھی، ایک نہرو، ایک پٹیل یا ایک ابوالکلام آزاد کیا اگر ان جیسے سینکڑوں لیڈر بھی ہوتے تو قائداعظم کا مقابلہ نہ کر پاتے۔

وہ کون سا جادو تھا جو قائداعظم محمد علی جناحؒ نے لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر کر دیا تھا وہ کیسی عظمت اور کشش تھی جو اس عظیم انسان کی شخصیت میں تھی۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری اور ابوالکلام آزاد جیسے جادو بیاں مقرروں کو چھوڑ کر برصغیر کے مسلمان قائداعظمؒ کی انگریزی میں تقریریں سننے کے لئے مسلم لیگ کے جلسوں میں کیوں آ جمع ہوتے تھے، کیا ایسا نظارہ چشم فلک نے کبھی دیکھا تھا کہ ہزاروں لاکھوں کا مجمع دم بخود بیٹھا ہے۔ قائداعظمؒ انگریزی میں تقریر کر رہے ہیں۔ سامعین میں نوے فی صد سے زیادہ لوگ انگریزی نہیں جانتے مگر قائداعظم کی گونج پیدا کرتی ہوئی دبدبے والی آواز کے زیروبم کے ساتھ ان کے دل دھڑک رہے ہیں، ان کا جوش وخروش اس آواز کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ میرے اباجی بتایا کرتے تھے کہ قرارداد پاکستان کے جلسے میں انہوں نے ایک بوڑھے دیہاتی سے پوچھا ''بابا! کیا تمہیں سمجھ آ رہی ہے۔ جناح صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''پتر! مجھے سمجھ تو نہیں آ رہی مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ بابا جو کچھ کہہ رہا ہے، سچ کہہ رہا ہے۔''

دنیا کی تاریخ کسی ایسے لیڈر کی مثال سامنے لانے سے قاصر ہے، جس کی آواز لوگوں کے دلوں پر یوں حکمرانی کرتی ہو۔ جس کی ایک جھلک دیکھتے ہی

لوگ فرطِ مسرت سے چیک اٹھتے ہوں، ان کی رگوں میں جوش اور ولولے کی برقی رو دوڑ جاتی ہو۔ فضاء قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی ہوتی مگر جونہی وہ اپنی انگشت شہادت بلند کر کے انہیں خاموش رہنے کی تلقین کرتے تو لاکھوں کا ہجوم یک لخت یوں خاموش ہو جاتا جیسے سوائے قائداعظم کے وہاں کوئی اور موجود ہی نہ ہو۔

اس طلسم اور اس اسرار کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو جو یقین کامل اور جو اعتماد قائداعظمؒ کی ذات اور ان کی بے مثال قیادت پر تھا وہ کسی اور پر نہیں تھا۔ 1907ء سے لے کر جب قائداعظمؒ نے ہندوستان کی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا، اکتوبر 1937ء تک جب لکھنؤ میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا، پورے تیس سال کے اس پُرآشوب دور میں جو واقعات و حادثات ہندوستان کی سیاست میں رونما ہوئے تھے وہ سب کی نظروں کے سامنے تھے۔ اس پورے عرصے میں جس تدبر جس سیاسی بصیرت، جس بے باکی، جس راست بازی، جس حیران کن دیانت اور جس ناقابلِ یقین حد تک بے لوث ایثار و قربانی کی مثال قائداعظمؒ نے اپنے طرزِ عمل اور کردار سے قائم کی تھی مسلمانوں کے دوسرے راہنما اس کی گرد تک بھی نہیں پہنچ پائے تھے بلکہ اکثر نے تو جوش میں آکر اور دشمنوں کے فریب میں پھنس کر مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، حکیم محمد اجمل جیسے لوگ ہندوؤں کی ذہنیت اور گاندھی کی چالوں کو نہ سمجھ سکے۔ ان علماء کی سادگی بلکہ سادہ لوحی دیکھئے کہ گاندھی جیسے سرتاپا ہندو لیڈر کو مسلمانوں کا خیرخواہ سمجھ بیٹھے۔ اس سے بھلائی بلکہ راہنمائی کی امیدیں لگالیں۔ حالانکہ گاندھی نے اپنی اصلیت کبھی چھپا کر نہیں رکھی وہ اپنے حقیقی افکار و خیالات کا برملا اظہار کرتا رہتا تھا۔ 1918ء میں گاندھی نے اپنے ایک بیان میں کہا

''ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہندو بھی ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤکشی سے آزاد کرانے کی امید نہ رکھتا ہو۔ جہاں تک میں ہندو مذہب کو جانتا ہوں، ہندو مسلمانوں اور عیسائیوں کو بزورِ شمشیر بھی گاؤکشی چھوڑنے پر مجبور کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔''

اچھوت (شُودر) ہندوستان کے قدیم اصلی باشندے ہیں۔ ہندو اچھوتوں کو ہندو نہیں سمجھتے، ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہبی صحیفے منوسمرتی میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شودر کسی دوتج یعنی اونچی ذات کے ہندو کے برابر بیٹھ جائے تو اس کی کمر میں داغ دے کر اسے گاؤں سے نکال دیا جائے یا پھر اس کے چوتڑوں کو تھوڑا سا کاٹ ڈالنا چاہئے۔''

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی پنڈت با آواز بلند مقدس ویدوں کی تلاوت کر رہا ہو اور اس کی آواز کسی شودر کے کان میں پڑ جائے تو اس شودر کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہئے کہ وہ بہرا ہو جائے۔

اس طرح کے انسانیت سوز عقائد کو ماننے اور اس طرح کا اندھا تعصب رکھنے والوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ مسلمانوں کے خیرخواہ ہو سکتے ہیں۔ ان مسلمانوں کے جنہوں نے ان پر ایک ہزار سال حکومت کی ہے، پرلے درجے کی ناسمجھی اور عاقبت نااندیشی ہے۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ انسانی مساوات اور برابری کے خالص اسلامی تصور پر یقین رکھنے والے اور عمل کرنے والے روشن خیال سیاست دان تھے۔ پھر ان کی سیاسی تربیت دادا بھائی نوروجی اور گوکھلے جیسے روشن خیال وسیع المشرف اور ہر طرح کے تعصب سے کوسوں دور سیاست دانوں کے زیر اثر ہوئی تھی۔ قائداعظمؒ نے کانگریسی لیڈروں کو بھی ان جیسا سمجھا اور اپنے سیاسی کیریئر کے آغاز میں ان سے یہ امیدیں لگائیں کہ وہ انصاف پسندی کا مظاہرہ کریں گے اور خوش دلی سے مسلمانوں کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے اور ان حقوق کی حفاظت کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔ قائداعظمؒ ہندوؤں کے حقوق اور ان کے مفاد کی خاطر کانگریس میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کا مقصد مسلمانوں کے حقوق اور ان کے مفادات کی حفاظت تھا۔ لارڈ پیتھک لارنس لکھتا ہے۔

''مسٹر جناح انڈین نیشنل کانگریس کے رکن اس لئے بنے تھے کہ ان کے خیال میں اس جماعت کے تحت ہندوستان کی ایک متحدہ حکومت قائم ہو سکتی تھی جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو نہ صرف یکساں حیثیت حاصل ہوگی بلکہ ان کا درجہ بھی مساوی ہوگا۔ مگر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ تجربے نے انہیں اس سے بالکل مختلف رائے قائم کرنے پر مجبور کر دیا، وہ اس بات پر قائل ہو گئے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کبھی بھی مساوی حیثیت یا مساوی مواقع حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان کے پچھلے ساٹھ سال کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے۔

قائداعظمؒ نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوششیں کیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد سے آزادی کی منزل آسانی سے اور جلد حاصل کی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا کیونکہ انگریز تو پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے اصول پر کاربند تھے۔ ان کی سیاسی پالیسی کی بنیاد Divide and Rule تھی مگر ہندو مسلمانوں سے اپنے سیاسی اختلافات دور کرنے اور برابری کی سطح پر ان کی جائز شرائط کو ماننے اور ان کے حقوق کو تحفظ دینے کے لئے کبھی تیار نہ ہوئے۔

دسمبر 1916ء میں قائداعظمؒ کی کوششوں سے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین لکھنؤ پیکٹ یعنی میثاق لکھنؤ طے پایا۔ اس کی رو سے دونوں سیاسی جماعتوں نے ایک دوسرے کی حیثیت اور حقوق کو تسلیم کیا اور انگریزوں کی غلامی سے ہندوستان کو آزادی دلانے کی خاطر مشترکہ جدوجہد کرنے پر اتفاق رائے ہوا۔ قائداعظم اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے کہا ''ہم نے آدھی جنگ جیت لی ہے۔'' مگر گاندھی اور

دوسرے انتہا پسند ہندو لیڈر میثاق لکھنو پر خوش نہ تھے۔ ان کا موقف تھا کہ کانگرس قائداعظم کی سیاسی چال میں آ کر مسلم لیگ کو ایک سیاسی جماعت اور مسلمانوں کو ایک سیاسی قوت تسلیم کرنے کی غلطی کر بیٹھی ہے جب کہ ہندوؤں کا اور کانگریس کا دعویٰ شروع سے یہی تھا اور یہی رہا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم اور ایک ہی عوامی سیاسی قوت ہے۔ اب گاندھی اور ان کے ہم نوا کسی نہ کسی طرح دو عوامی سیاسی قوتوں کی موجودگی کے اس تاثر کو زائل کرنے پر تل گئے جو میثاق لکھنو سے پیدا ہوا تھا۔ جلد ہی تحریک خلافت کا آغاز ہو گیا اور گاندھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔

ترکی نے جنگ عظیم اول میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا جب اتحادیوں کو فتح ہوئی اور اتحادی فوجوں نے استنبول پر قبضہ کر لیا تو دنیا بھر کے مسلمانوں میں اضطراب پھیل گیا۔ ہندوستان میں محمد علی جوہر اور شوکت علی نے جو علی برادران کے نام سے مشہور ہوئے، تحریک خلافت کا آغاز کر دیا۔ یہ خالص مسلمانوں کی تحریک تھی۔ خلافت صدیوں سے دنیائے اسلام کا مرکزی ادارہ تھی اور اگرچہ عملی طور پر یہ خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو چکی تھی مگر دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس ادارے سے بے پناہ جذباتی لگاؤ تھا۔ تحریک خلافت شروع ہوئی تو علی برادران کے ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں جیسے زعماء اور جادو بیان مقرروں نے ہندوستان کے طول وعرض میں مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی اور وہ سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل کھڑے آئے۔ گاندھی نے سوچا اس سے تو ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے اجاگر ہونے کی ایک اور صورت نکل رہی ہے، ایسا نہ ہو کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے سیسہ پلائی دیوار کی طرح مربوط اور مضبوط ہو جائیں چنانچہ وہ بھی تحریک خلافت میں کود پڑا اور پوری ہندو قوم کو تحریک خلافت کی حمایت کی خاطر میدان میں لے آیا۔ یہ اس کی ایک شاطرانہ سیاسی چال تھی۔ ظاہر ہے ایک انتہا درجے کے متعصب ہندو لیڈر کو خلافت اسلامیہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اپنے اس منافقانہ عمل سے وہ سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور میثاق لکھنو کے سیاسی تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ تحریک خلافت میں شامل ہو کر وہ ہندوستان کے سادہ دل مسلمانوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اور کانگریس مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کے محافظ ہیں۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ لیڈر کی حیثیت سے گاندھی کا سیاسی قد کاٹھ اتنا بڑھ گیا کہ وہ ہندوستان کی سیاست پر چھا گیا۔ اس سیاسی چال سے اس نے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے ابھرنے کے ایک نادر موقع کو مسلمانوں سے چھین لیا بلکہ مسلمانوں کی قیادت بھی مسلمان لیڈروں سے چھین لی۔ اس طرح گاندھی متحدہ قومیت کے تاثر کو فروغ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی چالاکی سے تحریک خلافت کو ایسے راستے پر ڈال دیا جو مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر لے جانے والا راستہ تھا۔ تحریک خلافت سے ترک موالات اور تحریک ہجرت تک بات جا پہنچی۔ گاندھی نے اپنے کارندوں کے ذریعے یہ تحریک مسلمانوں میں پھیلا دی کہ انگریز خلافت اسلامیہ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اس لئے جس ملک پر انگریزوں کی حکومت ہے مسلمانوں کو وہاں نہیں رہنا چاہئے اور احتجاجاً وہاں سے ہجرت کر جانی چاہئے۔ گاندھی کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہندوستان سے نکل جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ تحریک خلافت میں برابر کے شریک تھے تو آخر کیا وجہ ہے کہ کسی ایک ہندو نے بھی ہجرت میں مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا وہ بھی انگریزوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندوستان سے کوچ کرنے لگے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

ہجرت کی ترغیب صرف مسلمانوں کو دی گئی، ہزاروں مسلمان اپنا کاروبار اور گھر بار چھوڑ کر بال بچوں سمیت افغانستان اور دوسرے اسلامی ممالک کو ہجرت کرنے لگے۔ یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی وہ تو خدا کا کرنا یوں ہوا کہ انگریزی حکومت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ دنیا والے کیا کہیں گے۔ کیا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت اتنی ظالمانہ ہے کہ اس کی رعیت ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئی ہے چنانچہ حکومت نے مسلمانوں کو ملک چھوڑنے سے روک دیا اور سرحدیں بند کر دیں ورنہ گاندھی اور اس کا ٹولہ تو مسلمانوں سے ہندوستان خالی کرانے پر تل گیا تھا۔ تحریک خلافت کے کسی مسلمان لیڈر نے مسلمانوں کو عقل کی بات نہ سمجھائی۔ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہو گئے، کچھ خوار و زبوں ہو کر واپس لوٹے کچھ ملکوں ملکوں مارے مارے پھرتے رہے اور آخر تھک ہار کر کہیں نہ کہیں بیٹھ گئے۔ تحریک خلافت سے مسلمانان ہند کو جو نقصان پہنچا وہ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے آنے والی تباہی و بربادی کے بعد سب سے بڑا نقصان تھا۔ اس تحریک کے زمانے میں ترک موالات کے دوران مسلمانوں کو اس بات پر بھی اکسایا گیا کہ وہ احتجاجاً تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کر دیں یہاں بھی ہجرت کی طرح صرف مسلمان طلباء نے ہی اپنے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا۔ ہندو طلباء نے اپنی تعلیمی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں۔ مسلمان پہلے ہی تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ ان میں جو تھوڑا بہت تعلیم کا عمل جاری تھا وہ بھی رک گیا۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ تعلیمی درسگاہوں کے خلاف مسلمان طلباء کے جذبات اس قدر ابھارے گئے کہ ایک دن مشتعل طلباء کا ایک ہجوم ہندو طلباء کی قیادت میں علی گڑھ یونیورسٹی جا پہنچا۔ ہندو طلباء نعرہ بازی کر رہے تھے کہ یہ انگریز کی نشانی ہے۔ یہاں انگریزی تعلیم دی جاتی ہے اس کو آگ لگا دو۔ اس شور و غل کو سن کر شعبہ ریاضی کے سربراہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد جو اپنے کمرے میں مصروف مطالعہ تھے، باہر نکل آئے اور مشتعل طلباء کو سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے طلباء سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آپ

صرف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو جلانے کی بات کر رہے ہیں۔ ہندو یونیورسٹی بنارس میں تو معمول کے مطابق کام ہو رہا ہے، تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ نہ کسی نے اس کا بائیکاٹ کیا ہے نہ کوئی اسے جلانے کی بات کر رہا ہے۔ اس پر ہجوم میں شامل ہندو طلباء نے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے خلاف نعرہ بازی شروع کر دی۔ یہ انگریز کا ٹوڈی ہے۔ انگریز کا آدمی ہے اس کی بات پر کان نہ دھرو۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے بڑے موثر انداز میں کہا کہ آپ پہلے بنارس یونیورسٹی کو آگ لگائیں۔ پہلے اسے جلا کر دکھائیں تو علی گڑھ یونیورسٹی کو آگ لگانے والوں میں میں خود شامل ہو جاؤں گا۔ بلکہ پہلی دیا سلائی میں روشن کرونگا۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے کہ صرف مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو ہی نقصان پہنچایا جائے اور ہندوؤں کے تعلیمی ادارے بے کھٹکے اپنے معمول کے کام میں مشغول رہیں۔ کچھ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی شخصیت تھی کچھ ان کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ گروہ کے سرغنے آہستہ آہستہ کھسکنے لگے اور اس طرح مشتعل طلباء کا وہ ہجوم اپنے ارادے سے باز رہا۔ یہاں اس بات کو ریکارڈ پر لانا ضروری ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء کی بھاری اکثریت تحریک خلافت سے الگ تھلگ رہی۔

قائداعظمؒ کی سیاسی سمجھ بوجھ نے پہلے ہی ان پر واضح کر دیا تھا کہ تحریک خلافت سے مسلمانوں کو سخت نقصان ہوگا وہ نہ صرف خود اس سے الگ تھلگ رہے بلکہ تحریک خلافت کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس قدر جوش وخروش اور غیض وغضب میں آئے ہوئے تھے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی ایک نہ سنی بلکہ مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ مشہور کروا دیا کہ جناح تو انگریزوں کا آدمی ہے اس لئے تحریک خلافت سے الگ تھلگ بیٹھا ہے۔

تحریک خلافت کے بارے میں صرف قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ہی یہ موقف اختیار نہیں کیا کہ یہ مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی بلکہ علامہ اقبال کا اور مولانا حسرت موہانی کا بھی یہی موقف تھا۔ قائداعظم کی طرح علامہ اقبال بھی اس تحریک سے بالکل الگ تھلگ ہو کر بیٹھے رہے۔ گاندھی کی شمولیت کے بعد تحریک جو رخ اختیار کر رہی تھی اس پر ان زعماء کو سخت اضطراب تھا۔ وہ اس میں سراسر مسلمانوں کے نقصانات کے امکانات کو واضح طور پر دیکھ رہے تھے مگر انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کریں۔ جوش وخروش کا ایک ایسا جذباتی ریلا تھا جس میں سارے مسلمانان ہند کو بہا دیا گیا۔ جناح اور اقبال کی بات پر کان دھرنے کو کوئی تیار ہی نہ تھا۔

قائداعظم نے تحریک خلافت کو غلط اور ضرر رساں سمجھتے ہوئے اس میں حصہ نہ لیا لیکن وہ مسلمانوں کے مفادات سے ہرگز غافل نہ تھے۔ ان مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لئے جس طریق کار کو وہ صحیح سمجھتے تھے اسے بلا تامل انہوں نے اختیار کیا۔ وہ لندن تشریف لے گئے۔ برطانوی وزیراعظم سے ملے اور برطانوی حکومت کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی کہ جنگ عظیم کے خاتمے پر صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے پیرس میں جو امن مذاکرات ہو رہے تھے ان میں مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا ایجنڈا بھی شامل کیا جائے تاکہ وہ امن کانفرنس کو خلافت کے مسئلے پر مسلمانوں کے جذبات واحساسات سے آگاہ کرے۔

قائداعظم نے برطانوی وزیراعظم سے کہا جنگ میں مسلمانان ہند نے انگریزوں اور اس طرح اتحادیوں کا ساتھ دیا تھا اس کے صلے میں وہ کم از کم یہ حق رکھتے تھے کہ خلافت کے مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان کا موقف بھی سنا جائے۔ جنگ سے پہلے انگریزوں نے مسلمانان ہند سے اس سلسلے میں جو وعدے کئے تھے انہیں پورا کیا جائے اور خلافت کے سوال پر دنیائے اسلام اور خاص کر مسلمانان ہند کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے۔ قائداعظم کی کوششوں کے باوجود امن کانفرنس میں مسلم لیگ کے کسی نمائندے کو شریک کرنے کے لئے انگریزوں نے کوئی پیش رفت نہ کی۔ اس سارے قضیے کا ڈراپ سین اس وقت ہوا جب مصطفےٰ کمال نے ترکی میں برسر اقتدار آ کر خلافت کے دیمک زدہ اور بے کار ادارے کو خود ہی دریا برد کر دیا۔

تحریک خلافت پر مندرجہ بالا بحث سے مقصد یہ تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح اور مسلمانوں کے دوسرے لیڈروں میں جو فرق اور امتیاز تھا اسے واضح کیا جا سکے۔ ان کی سوچ اور طریق کار میں جو اختلاف تھا وہ اجاگر ہو۔ لیڈر کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی جذبات کی تند وتیز رو میں بہہ جائے اور اپنی جماعت کو بھی یوں اندھا دھند بہا کر لے جائے کہ کنارہ مل ہی نہ سکے۔ لیڈر کا کام تو حکمت وتدبر اور فہم وفراست کے ساتھ اپنی جماعت کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہوتا ہے۔

1907ء سے لے کر 1937ء تک پورے تیس سال کے عرصے میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے جو واقعات پیش آئے۔ قائداعظم نے جس طرح ان واقعات کا سامنا کیا اور جو طرز عمل اختیار کیا اس سے مسلمانوں کو پھر یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی تھی کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت اور ان کے بے مثل فہم وتدبر پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا انہیں منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ 19 جون 1937ء کو علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھا ''ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جو اپنی قوم کو اس طوفان سے جو ہندوستان پر ٹوٹنے والا ہے بچا سکتے ہیں اور اس لئے قوم کو حق ہے کہ وہ آپ سے راہنمائی کی امید رکھے۔''

قائداعظمؒ کی زندگی کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیا کوئی شخص اتنا راست باز اس قدر بے باک اور اتنا دیانت دار بھی ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

دوسری کئی خوبیوں کے ساتھ قائداعظمؒ کی شخصیت اور کردار میں یہ تینوں خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان کے قول و فعل میں جو مطابقت اور ظاہر و باطن میں جو ہم آہنگی تھی جس خلوص اور صدق دل سے انہوں نے مسلمانوں کی قیادت کا حق ادا کیا، وہ حق وصداقت کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اپنے کردار و عمل میں عدل وانصاف کے تقاضوں کا جس قدر خیال رکھتے تھے، ہر کسی سے جس طرح وہ بلا رورعایت مساوی سلوک کرتے تھے۔ دوسروں کے جذبات و احساسات کا جتنا انہیں پاس تھا، انگریزوں کی جابرانہ حکومت کے سامنے کھل کر بے خوف وخطر حق بات کہنے کی توفیق جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں ارزانی کر رکھی تھی، اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ دیکھنے میں دبلے پتلے اور نحیف ونزار تھے مگر جو شجاعت، جو جرات اور دلیری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی، جتنے بے باک اور نڈر وہ تھے کوئی دوسرا نہ تھا۔ ان کی ساری شخصیت ان کے اس زریں قول کی آئینہ دار تھی کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں کبھی سودے بازی نہ کی جائے۔ جتنے بے لوث ہر طرح کے لالچ سے پاک اور ایثار پیشہ وہ تھے، غریب اور نادار عوام کا جتنا احساس اور ان سے جتنی ہمدردی انہیں تھی، نازک اور دل دہلا دینے والے حالات میں اپنے جذبات پر جتنا کنٹرول انہیں حاصل تھا، یقین محکم اور خوداعتمادی کی جو بے اندازہ دولت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہوئی تھی، فراست وبصیرت کی جو نعمت ان کے حصے میں آئی تھی، حکمت و تدبر کے خیر کثیر سے جو وافر حصہ ان کو ملا تھا، ان کی تحریر وتقریر جتنی واضح، دوٹوک، موثر اور دل نشیں ہوتی تھی، ان کے خدوخال میں جو جاذبیت، ان کی آنکھوں میں جو چمک ان کے لباس کی تراش خراش میں جو نفاست اور حسن تھا اور ان کی پوری شخصیت میں جو جلال و جمال تھا اس کی مثال دنیا کے کسی بڑے لیڈر میں نہیں ملتی۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اپنی انہی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے اور شبانہ روز کی جاں توڑ محنت کے طفیل قائداعظم نے وہ بے مثال کامیابی حاصل کی جو دنیا کے نقشے پر پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں قائم ودائم ہے۔ قائداعظمؒ کا کارنامہ کیا تھا ذرا پروفیسر سٹینلے والپرٹ (مصنف جناح آف پاکستان) کے ناقابل فراموش الفاظ میں دیکھئے۔

''بہت کم شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں ان میں سے بھی کہیں کم تعداد میں ایسی شخصیات ہونگی جو دنیا کے نقشے کو بدل کر رکھ دیں مگر ایک نئی قوم اور ایک نئے ملک کی تخلیق کا سہرا تو شاید ہی کسی کے سر ہو۔ قائداعظمؒ نے یہ تینوں کارنامے کر دکھائے''۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی عظمت کا اندازہ اس اعتراف اور خراج تحسین سے لگائیں جس کا برملا اظہار ان کے سیاسی حریفوں بلکہ دشمنوں نے کیا۔ ان کی رحلت پر روزنامہ ''پربھارت'' (دہلی) نے لکھا ''متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں۔''

یہ عظیم الشان کارنامہ، یہ بے مثال کامیابی، یہ صداقت یہ راست بازی یہ جرات اور دلیری، اپنے مقصد کی حقانیت پر یہ اعتماد اور اپنی کامیابی کا یہ یقین جو قائداعظم کی سوانح حیات کے ہر صفحے سے مترشح ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے گہرے قلبی تعلق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور اس کی قدرت کاملہ پر پختہ ایمان اور توکل کا جو عملی مظاہرہ قائداعظمؒ کی زندگی کے واقعات میں ہمیں ملتا ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں کسی عوامی راہ نما میں نظر نہیں آتا۔ حضورؐ پرنور کا اسوہ حسنہ اور صحابہ کرامؓ خاص کر حضرت عمرؓ کی شخصیت اور ان کی حکمت و تدبر کا نمونہ ہمیشہ قائداعظم کے پیش نظر رہا۔

مولانا ظفر علی خاں نے علامہ شبلی نعمانی کی الفاروق کا انگریزی میں جو ترجمہ کیا تھا ان کے مطالعہ کی میز پر ہمیشہ موجود رہتا تھا۔

مشہور شاعر اور دانش ور ڈاکٹر محمد دین تاثیر قائداعظمؒ پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''ایک دن حضور پرنور حضرت محمدؐ سے کسی نے کہا ''آپ کو صدیق اکبرؓ میں کیا ممتاز خصوصیت نظر آتی ہے''؟ حضورؐ نے فرمایا ''ابوبکر صدیقؓ میں ایک خاص ادا ہے، ایک خاص بات ہے۔'' اس کا ذکر رسول مقبول محبوب خدا ﷺ کے اپنے الفاظ مبارک میں سنیئے، فرمایا ''شیاً وقع فی قلبه ''ایک شئے ہے جو اس کے دل میں ہے۔ یعنی اس کا تعلق ظاہری اطوار وحالات سے نہ تھا۔ یہ دل کی بات تھی۔ یہی کیفیت محمد علی جناحؒ کی تھی۔''

'ڈاکٹر تاثیر مزید لکھتے ہیں: ''ایک شخص کے راستے میں کیسے کیسے پہاڑ تھے مگر اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ اس کے خلوص قومی میں فرق نہ آیا۔ اس کا ہر قومی عمل اللہ کے لئے تھا اس لئے اس کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ ہر مجاہد حق کے دست شمشیر زن پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے''۔ اقبالؒ کا یہ شعر حضرت قائداعظمؒ کی شخصیت و کردار کا اظہار کرتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشاء کار ساز

قائداعظمؒ کی زندگی میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے گہرے قلبی تعلق اور حضور ﷺ سے ان کی محبت اور قرآن حکیم سے ان کی شیفتگی کا ثبوت ملتا ہے۔

اس مضمون میں قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت و کردار کی گوناگوں خوبیوں اور ان کے فکروعمل کے مختلف پہلوؤں کی طرف محض اشارہ کرنا ہی ممکن تھا، ان کی شخصیت کی ہر خوبی اور ہر پہلو پر ایک الگ مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اقبال اور بابر

ڈاکٹر جاوید اقبال

اقبال اور بابر کے موضوع کا صحیح جائزہ اُسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جب ہم برصغیر کے اُس وقت کے حالات کے تاریخی نہیں منظر کو دھیان میں رکھیں جو بابر کے ہندوستان پر حملے کے وقت تھا اور ساتھ ہی اس وقت کے ہندوستان کے مسلمانوں اور عالمِ اسلام کی مجموعی صورتِ حال بھی پیش نظر ہو جب علامہ اقبال افغانستان کے بادشاہ نادر شاہ کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تھے۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا بانی، شہنشاہ بابر جو عظیم فاتح تیمور کی اولاد میں سے تھا، 1481ء میں موجودہ ازبکستان کے شہر فرغانہ میں پیدا ہوا۔ 1495ء میں اپنے والد عمر شیخ میرزا کی وفات پر فرغانہ کا حکمران بنا۔ فرزغانہ کے نامساعد حالات سے دل برداشتہ ہو کر وہ 1504ء میں کابل کی جانب بڑھا۔ کابل کو فتح کرنے اور اس کا حکمران بننے کے بعد اس کی توجہ ہندوستان کی جانب مبذول ہوئی۔

بابر کے حملے کے وقت ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں بٹا ہوا تھا۔ اگرچہ ماضی قریب میں کئی حکمرانوں نے اردگرد کی راجدھانیوں کو فتح کر کے اپنے خاندان کے لیے ایک متحدہ اور وسیع تر سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ سب کوششیں بالآخر رائیگاں گئیں۔ دہلی پر قبضے کے بعد بابر نے 1526ء میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے جانشینوں نے دوسو سال تک برصغیر کو ایک ملک کی صورت میں متحد رکھا اور استحکام اور خوش حالی سے ہمکنار کیا۔ مگر بعد میں مغلیہ سلطنت زوال اور انتشار کا شکار ہوگئی۔ بالآخر 1857ء میں برطانیہ نے ہندوستان کو اپنی کالونی بنالیا۔

آخری مغل تاجدار (بہادر شاہ ظفر) کی تخت دہلی سے بے دخلی اور جلاوطنی کے 20 سال بعد 1877ء میں اقبال نے سیالکوٹ کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ہندوستان اس وقت سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ تھا۔ جس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اسلامی اقدار کے حامل ایک مسلم خاندان کا چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے اور اسلام کی عظمت رفتہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کی شاندار روایات کے مطالعے اور شعور کی وجہ سے اقبال برصغیر کے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی پر بالخصوص اور عالم اسلام کے زوال اور انتشار پر بالعموم گہرے دکھ اور احساس زیاں میں مبتلا تھے۔ وہ تعلیم کے حصول کے لیے پہلے لاہور اور اس کے بعد لندن اور ہائیڈل برگ گئے۔ لندن میں لنکنز ان سے انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ انگلستان اور جرمنی میں اپنے قیام کے دوران سائنس، طب اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں مغربی اقوام کی ترقی اور حیران کن پیش رفت کا مشاہدہ کیا۔ اقبال کو اس بات کا گہرا دکھ اور احساسِ محرومی تھا کہ مسلمان جنہوں نے ان علوم کا آغاز کیا تھا بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

ہندوستان واپس آ کر اقبال برصغیر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے مشن پر کمر بستہ ہو گئے۔ انہوں نے فرزندانِ اسلام کو اسلام کی عظمت رفتہ کی یاد دلائی اور اپنی شاعری سے ان میں از سرِ نو اُٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ پیدا کرنے کا کام لیا۔ ان کو تجسس اور جدوجہد کے راستے پر گامزن کیا۔ اپنے پُر اثر کلام اور تحریروں سے مسلمانوں میں ترقی اور آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرنے کے لیے اقبال نے تحریک پاکستان میں کلیدی کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو اپنی ایک علیحدہ آزاد مملکت کے قیام کا تصور دیا۔

اگرچہ عام طور پر علامہ اقبال کو برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی میں راہ نمائی کی وجہ سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف مسلمانانِ برصغیر ہی نہیں بلکہ سارے عالم اسلام اور بالخصوص وسط ایشیائی مسلم اقوام کی پستی اور زوال کے تدارک میں بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس وقت یہ تمام ممالک غیر ملکی استعمار کا شکار تھے۔ اس دور میں افغانستان ہی وہ واحد اسلامی ملک تھا جو آزاد تھا۔ اقبال افغانستان کو برصغیر اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مابین ایک اہم واسطہ سمجھتے تھے اور ان ممالک کے مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد میں افغانستان کو مشعلِ راہ خیال کرتے تھے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں افغانستان اندرونی انتشار کا شکار رہا۔ بالآخر جنرل نادر خان نے اس پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور نادر شاہ کے نام سے افغانستان کا حکمران بن گیا۔ اقبال اپنے فارسی کلام کی وجہ سے افغانستان کے علمی حلقوں میں مشہور و معروف تھے۔ 1933ء میں نادر شاہ نے علامہ اقبال، سر راس مسعود اور مولانا سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے ملک کی تعلیمی اصلاحات اور حکمت عملی کے لیے راہ نمائی کا خواہاں تھا۔ یہ ہندوستان سے باہر اقبال کا آخری سفر تھا اور اسی سفر کے دوران اقبال نے کابل کے نواح میں بابر کے مزار کی زیارت کی اور ''برمزار شہنشاہ بابر خلد آشیانی'' کے

زیرعنوان ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی اقبال نے اپنے پیغامِ حُریت و آزادی کا اظہار کیا اور یہ تلقین کی کہ برصغیر اور باقی ممالک کے محکوم مسلمان غلامی کا طوق اپنے گلے سے اُتار پھینکیں۔ اپنی عظمت رفتہ کے حصول کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ اقبال نے اس نظم میں اپنے اس گہرے دکھ کا اظہار بھی کیا کہ مسلمانوں پر ہر جگہ ابتلاء اور زوال مسلط ہے۔ اس نظم کی خاص بات یہ ہے کہ اقبال، بابر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ”اُٹھو اور ہندوستان کو پھر فتح کرو (اور غیرملکی استعمار سے آزادی دلاؤ)

میرے خیال میں اقبال کا بابر سے یہ خطاب ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نظم میں اقبال مغلوں کی شوکتِ رفتہ کو یاد کرتے ہیں اور غلامی کی ذلت کا موازنہ آزادی کی نعمت سے کرتے ہیں۔ اس نظم سے بابر کے ساتھ عقیدت اور وسط ایشیائی مسلمانوں کے ساتھ اقبال کی محبت مترشح ہے۔ اس نظم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو اُمید تھی کہ وسط ایشیائی مسلم ممالک اور افغانستان، برصغیر کے مسلمانوں کا رابطہ اور رشتہ دنیائے اسلام سے جوڑ دیں گے۔

اقبال کا خیال تھا کہ مستقبل میں اس سارے خطے کی بین الاقوامی تجارتی شاہراہ افغانستان سے ہو کر گزرے گی۔ سمندر کے راستے تجارت کا رُجحان کم ہو جائے گا اور یہ پیش برفت اسلام کی عظمت رفتہ کے احیاء کا باعث بنے گی۔ ان امکانات کی بنا پر علامہ اقبال نے ہمیشہ افغانستان اور وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔

انہیں یقین تھا کہ ایک آزاد اور خودمختار افغانستان نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے ضروری ہے بلکہ وسط ایشیائی مسلمان ریاستوں کو بھی آزادی اور استحکام سے ہم کنار کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ یہ امر یقیناً دلچسپی کا باعث ہے کہ افغانستان پر رُوس کے حملے (1982) کے نتیجے میں سوویت یونین کے انہدام سے اقبال کا یہ تصور ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہے۔ روسی افواج پر افغانستان کی فتح سے ہی وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کی آزادی ممکن ہوئی ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ ہے کہ اب خود افغانستان اور کابل جہاں بابر محوِخواب ہے، غیرملکی تسلط کا شکار ہے۔

اقبال کا اصل مطمح نظر اور ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ دنیائے اسلام متحد ہو جائے۔ ہر مسلمان ملک مضبوطی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے اور پھر تمام مسلم ممالک ایک خاندان کے افراد کی طرح اخوت کے رشتے میں ڈھل کر ایک اُمت واحد بن جائیں۔ اسلامی ملکوں کی ایک ریاست ہائے متحدہ کی تشکیل ہو یا تمام مسلم ممالک مل کر ایک کنفیڈریشن بنا لیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم ان کا آپس میں ثقافتی معاشی اور فوجی شعبوں میں باہمی تعاون اور اشتراک کا ایک مضبوط اتحاد قائم ہو جائے۔ علامہ اقبال کا خیال تھا کہ بالآخر اسلامی دنیا کسی نہ کسی طرح ایک جغرافیائی وحدت (بلاک) کی صورت اختیار کر لے۔

حضرت قائداعظمؒ کی قائدانہ بصیرت اور محنت سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا علامہ اقبال کا خواب تو پورا ہو گیا مگر عالمی سطح پر ایک اسلامی بلاک کا ان کا خواب ابھی تشنۂ تعبیر ہے۔ شاید روحِ اقبال اس انتظار میں ہے کہ بابر اُٹھے اور مسلمانوں کو اتحاد اور ترقی کے راستے پر گامزن کر دے۔ (انگریزی سے ترجمہ: جمیل یوسف)

اقبالؒ

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا

سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا

تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں

چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کے لے سے سیکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز

یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز

جیسے چراغ وحشت صرصر سے بے خطر
یا شمع بزمِ صبح کی آمد سے بے خبر

فیض احمد فیض

کہانی تھک کر سوگئی ہے

اصغر ندیم سیّد

میں نیشنل ہسپتال کے آئی سی یو میں انتظار حسین کو آخری سانسیں لیتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کہانی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ کہانی تھک گئی ہے۔ کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہے تو کوئی بات نہیں آرام کرلے۔ کسی صبح چڑیوں کے شور میں تازہ دم ہو کر اُٹھے گی اور پھر سے جاری ہو جائے گی لیکن کہانی خاموش تھی۔ پھر میں نے انتظار حسین کے مجموعے ''آخری آدمی'' کو یاد کیا۔ جس کے آغاز پر قرآنی آیت لکھی تھی ''اور تم کہانیاں کہتے رہو تا کہ لوگ سوچ بچار کریں'' اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ کہانی تو انسانوں کے بیچ جاری رہے گی۔ ہم لوگ ہی بیچ میں اُٹھ جائیں گے۔ تو کیا قصہ گو قصہ سناتے سناتے خود بھی سو سکتا ہے۔ ایسا سنا تو نہیں مگر کسی نے یہ بھی تو کہا ہے:

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

تو کیا انتظار حسین کو کہانی کے بیچ ہی میں نیند آگئی ہے یا وہ کہانی کے بیچ میں سے اُٹھ کر جا رہے ہیں۔ مگر یہ تو کہانی کے ساتھ بے وفائی ہے۔ ''شہرزاد'' نے تو الف لیلیٰ کی ہزاروں راتوں میں کبھی تھکنے کا ذکر نہیں کیا نہ اُنھیں اونگھ آئی۔ ارے کوئی کہانی کے درمیان میں سے اُٹھ کر جاتا ہے۔ نہیں انتظار صاحب آپ اپنے قول کا پالن کریں آپ تو وضعدار آدمی ہیں۔ آپ کیسے کہانی کو ادھورا چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ آپ کا ایک پسندیدہ شعر ہے جو اکثر آپ کی کتابوں میں لکھا ملتا ہے:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دُھن کی پوری ہے کام کی پکی

کہانی تو اس پن چکی کی طرح ہوتی ہے اور قصہ گو دُھن کا پورا اور کام کا پکا ہوتا ہے۔ پھر آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں۔ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ نانی اماں کہا کرتی تھیں کہ کہانی دن میں نہیں کہتے۔ مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تو پھر آپ دن کے دو بجے یہ کیا کہانی سنا رہے ہیں۔ اس سے مسافر راستہ بھول جائیں گے۔ آپ نے میرا راستہ بھلا دیا ہے۔ آپ چلے گئے، کہانی چلی گئی۔ جن کبوتروں اور چڑیوں کو آپ کہانی کا چوگا دیا کرتے تھے وہ اب منقار زیر پر ہیں اور جنگل اُداس ہے۔ اگلے لمحے میں نے سوچا کہ کہانی سوگئی ہے مگر وہ تو میرے اندر بسرام کر چکی ہے۔ کہانی ان دیکھے راستوں اور وادیوں کے سفر پر روانہ ہو چکی ہے لیکن جو کہانی اپنی جڑوں کی تلاش میں نکلی تھی وہ تو ہمارے پاس ہے۔ میں اس کہانی کو محسوس کر سکتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ کہانی بھی سانس لیتی ہے۔ وہ میرے اندر سانس لے رہی ہے۔

کہانی دیس دیس گھومتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہے۔ دنیا جہان کی صحبتوں میں رہتی ہے۔ تب کہیں اُس کا شیرہ گاڑھا ہوتا ہے۔ میرٹھ کی آب و ہوا میں پلنے والا پودا لاہور کی مٹی میں جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر لاہور کے چائے خانوں اور مجالس میں طوطی شیریں مقال کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔ مگر وہ نہ تو نعرہ لگاتا ہے نہ گھن گرج سے دوسروں کو زیر کرتا ہے۔ وہ تو دھیمے سروں میں بس ناصر کاظمی کے شعر کی طرح بس تازہ ہوا کی طرح دل میں لہر بن کر اُٹھتا ہے۔ نام اس کا انتظار حسین ہے۔

دل میں اک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

اب یہ تازہ ہوا جو چلی تو کہانی کے بن میں کوئی نئے انداز کی کوئل کوکی۔ آواز سب نے سنی۔ کسی نے کہا یہ آواز تو ماضی کی بھول بھلیوں سے آ رہی ہے۔ کسی نے کہا کہانی میں نظریے کا تڑکا نہیں لگا ہوا اور پھر ''آخری آدمی'' سے ایک حیرت کدے کا جنم ہوا جس نے ترقی پسندوں اور جدت پسندوں کو ششدر کر دیا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا کہ یہ یادنگاری سے اچانک استعارے اور علامت کے ساتھ داستانوں کا لبادہ اوڑھ کے اپنے زمانے کے سیاسی سماجی اور تہذیبی ڈھانچے کو چیلنج کر رہا ہے۔ یہ تو ہند اسلامی ثقافت کے تال میل سے جادوگر کی طرح ہمیں ہمارے زوال کی نشانیاں دکھا رہا ہے۔ اب تو پورے ہندوستان کی تنقید کو بس انتظار حسین مل گیا۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور ترقی پسندوں کے قافلے منہ تکتے رہ گئے۔ پھر سانحہ مشرقی پاکستان ہو گیا۔ تاریخ نے ایک اور جلوہ دکھایا۔ انتظار حسین پہلے پورے پاکستان کا فکشن رائٹر تھا اب سکڑ کر صرف مغربی پاکستان کا رائٹر رہ گیا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ یہیں اپنے وطن سے طاقت لے کر پوری اردو دنیا پر راج کریں گے۔ رائٹر کی سرحد تھوڑی ہوتی ہے۔ سو یہ تو انتظار حسین نے سوچ لیا لیکن سانحہ مشرقی پاکستان پر خاموش رہنا جرم تھا۔ انتظار حسین نے اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔ مگر کیسے؟ خاکسار کو یہ اعزاز حاصل رہے

گا کہ سانحہ مشرقی پاکستان پر پہلا بڑا افسانہ ''شہرِ افسوس'' میری خواہش پر انتظار حسین نے سب سے پہلے ملتان کی ''شامِ افسانہ'' میں پڑھا۔ یہ اگست ۱۹۷۲ ہے۔ انتظار حسین دوپہر میں ریل گاڑی سے ملتان پہنچے۔ میں انھیں لے کر اپنے گھر آیا۔ اماں نے کھانا بنایا ہوا تھا کہ ڈاکیہ آیا۔ خط دیا۔ انتظار صاحب کے سامنے کھولا۔ میری لیکچرر کی تقرری کا سرکاری پروانہ تھا۔ نہال ہو گیا۔ انتظار صاحب میری زندگی میں تبرک بن کر آئے۔ اور پھر اب تک برکت بن کے رہے۔ مجھ پر حملہ ہوا تو سب سے پہلے ڈاکٹرز ہسپتال میں انتظار حسین پہنچے لیکن پہلے یہ بتا دوں کہ ملتان کی ''شامِ افسانہ'' میں جب انتظار حسین نے ''شہرِ افسوس'' پڑھا تو یہ چالیس منٹ کی ریڈنگ تھی۔ جب افسانہ ختم ہوا تو سننے والوں کی سسکیاں سنی جا سکتی تھیں۔ دس منٹ کی ریڈنگ میں سب رو رہے تھے۔

اب مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو انتظار حسین میرے ساتھ تہران میں ہیں اور ہم ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہیں۔ ہم دونوں ایران کے تھیٹر فیسٹول میں آئے تھے۔ پندرہ دنوں میں انتظار صاحب نے اپنے معمولات کا اسیر بنا لیا۔ صبح ناشتے میں اتنے ''تخم مرغ'' (انڈے) کھائے کہ انتظار حسین نے سری پائے کھانے کی فرمائش کر دی۔ اگلی صبح ناشتے میں جب سری پائے کی ڈش سامنے آئی تو بکرے کی دونوں آنکھیں ہمیں ڈش میں سے گھور رہی تھیں۔ انتظار صاحب نے چیخ ماری اور ''تخم مرغ'' پر گزارا کیا۔ ایک دن میزبانوں سے کہا کہ اتنے دن چلو کباب اور جوجہ کباب کھا کے بور ہو گئے ہیں۔ کوئی اپنا روایتی فوڈ تو چکھائیں۔ وہ لے گئے ایک زیرزمین ویستوران میں۔ عجب نظارہ تھا جیسے الف لیلوی سیٹ گیا ہوا ہو۔ حسینائیں ایرانی لباسوں میں شیشہ پی رہی تھیں۔ بیرے روایتی عربی لباسوں میں خدمت پر مامور تھے۔ انتظار حسین خوش ہوئے کہ میں الف لیلیٰ کے زمانے میں آ گیا ہوں۔ وہ شہرزاد بیٹھی کہانی سنا رہی ہے۔ اُدھر کوئی مرجینا مہمانوں کی تواضع کر رہی ہے۔

اب میں دیکھتا ہوں انتظار حسین پرانی دلّی میں میرے ساتھ ہیں۔ کبھی غالب کی دلّی تلاش کرتے ہیں کبھی ظفر اور ذوق کی دلّی کا تماشا کرتے ہیں۔ کھانے کے شوقین ہیں۔ دلّی کے ذائقے ڈھونڈتے ہیں۔ مگر دلّی کی نہاری پسند نہیں آ رہی۔ لاہور کی یاد کرتے ہیں۔ یہ کوئی اور کانفرنس ہے مگر ہے تو دلّی۔ میری بیوی شیبا انھیں لیے لیے پھر رہی ہے۔ کہیں سیڑھیاں چڑھنے میں مشکل نہ ہو۔ ان کے بچپن کے دوست ریوتی آئے ہیں۔ شیبا چائے بنا رہی ہے۔ کیا صحبتیں ہیں۔ کبھی انڈیا انٹرنیشنل سینٹر ہے تو کبھی گوپی چند نارنگ کا ڈنر۔ چہک رہے ہیں۔ پھر شمیم حنفی کے گھر کا پلاؤ انھیں کھینچے جاتا ہے۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔ ارے یہ تو بنگلور آ گیا۔ یہاں شیبا انھیں بھانجیوں کے لیے ساڑھیاں پسند کر کے دے رہی ہے۔ گریش کرناڈ انتظار صاحب کو ان کی وہ کہانی یاد کراتے ہیں جو بکرم بے تال سے تھی۔ اب ہم ٹیپو سلطان کے مزار پر کھڑے ہیں۔ انتظار صاحب ہمیں تاریخ سنا رہے ہیں۔ سب جگہ علم تعزیہ کی زیارت کرتے ہیں کہ ایک سوزخواں ملتا ہے۔ اس سے شامِ غریباں کا نوحہ سنتے ہیں۔ آصف الدولہ اور حضرت گنج کو یاد کرتے ہیں۔

اتنی بے شمار محفلیں اور سفر کر کے اور ان کی کتابیں پڑھ کے میں بھی خود کو ان کے زمانے کا آدمی سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ لگتا ہے ڈبائی کی کربلا میں ان کے ساتھ کھڑا ہوں۔ بائیس رجب کے کونڈوں کی نیاز کو ان کے گھر ہر سال باقاعدگی سے جاتے۔ اب یاد کرتا ہوں کہ میں تو ان کے ساتھ ساتھ بڑا ہوا ہوں۔ حسن عسکری، کرار حسین، ناصر کاظمی، احمد مشتاق، شہرت بخاری، مظفر علی سیّد جیسے ان کے دوست ویسے میرے دوست۔ آصف فرخی انھیں لندن گھما رہے ہیں۔ دلّی گھما رہے ہیں اور وہ ان کی اُنگلی تھامے مسرور ہیں۔ اِدھر میں انھیں کراچی لے کر جا رہا ہوں۔ اسلام آباد کی فلائٹ کے انتظار میں دنیا جہان کے واقعات چل رہے ہیں۔ یہ داستان گو کیسا ہے۔ داستان سوتے جاگتے میں جاری ہے۔ قصہ سوتے جاگتے کا تو سنا تھا۔ شاید وہ انتظار صاحب کا ہی قصہ تھا۔ عجیب زمانہ ہے ان کے آئیڈیل قصہ گو میر باقر علی کا انجام تو کچھ اچھا نہ ہوا۔ قصے کا دفتر لپیٹا گیا۔ کہانی سننے والے بائیسکوپ دیکھ کر دل بہلانے لگے۔ وہ چھالیہ بیچنے لگے مگر کچھ اس ڈھنگ سے کہ گاہکوں کو کہانی کا مزہ آنے لگا لیکن انتظار کے سننے والے تو اُٹھ کر نہیں گئے۔ مجمع ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ ان کی داستان کے دور چل رہے ہیں۔ مگر کیا ہوا کہ کہانی تھک کر سو گئی۔ مجمع تو موجود ہے۔ کہانی کے انتظار میں بیٹھا رہے گا۔ کہانی ضرور آئے گی۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر۔ایک ہمہ جہتی تخلیقی شخصیت

نسیمِ سحر

جناب جسٹس (ر) میاں نذیر اختر سے میرا پہلا تعارف براہِ راست نہیں بلکہ اُن کے نعتیہ مجموعے ''عُود نگر'' کے حوالے سے ہوا۔اسی میں ان کے تقریباً تیس اشعار ''موئے مبارک'' کے عنوان سے ہیں جن میں وہ اپنے گھر میں اس انمول تبرک کی موجودگی کے سبب اپنی خوش طالعی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بنا ہے مرے گھر میں مدینہ کا مسافر
ہے باعثِ برکات و بہا مُوئے مبارک

پھر ایک روز جب انہوں نے میرے گھر کو اپنی آمد سے منور کیا تو اُن کی شخصیت، اُن کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ مدینۂ منورہ جسے انہوں نے اس شعر میں ''عودنگر'' کا عنوان اِس انداز میں دیا ہے:

اے عودنگر ، رشکِ ارم، شہرِ مدینہ
فردوس کی خوشبو ہو ترے نام کے صدقے

وہ تو اُن کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے اور اُن کا ہر عمل اور ہر قول اسی ''عودنگر'' کی خوشبو میں رچا بسا ہوا ہے۔اُن کے گھر کی طرح اُن کی ذات کے اندر بھی یہی عُود نگر آباد ہے اور اِسی کی خوشبو جناب نذیر اختر کے ہر ملاقاتی کو معطّر و معنبر کر دیتی ہے۔اُن کی ذات کے اِرد گرد مہکنے اور دمکنے والا نورانی ہالہ اُن کا خود ساختہ نہیں بلکہ اللہ اور اُس کے پیارے رسول حضرت محمد ﷺ سے بیکراں عشق وعقیدت کے نُور سے بنا ہوا ہے۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے والے انتہائی درویش منش شاعر راولپنڈی کے ایک معروف خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی رہے اور بیت المال پنجاب کے ''امین'' بھی۔انہوں نے کئی مواقع پر اعلیٰ ترین سرکاری عہدوں کی پیشکش اپنی صداقت بیانی اور اُصول پسندی کے عوض پائے حقارت سے ٹھکرا دی۔

اُن کا قرآن وحدیث کا مطالعہ ایک طرف اور حمد و نعت کے فنی پہلوؤں سے مکمل شناسائی دوسری طرف فکر و خیال کے ایسے ایسے منظر نامے پیش کر رہی ہے کہ ہر شعر پڑھ کر انسان جھومتا رہے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا جائے۔اُن کے کلام میں آدابِ عقیدت و احترام کی بھرپور موجودگی کے ساتھ ساتھ جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کا فکری پہلو ہے، عشق کی کیفیات کے ساتھ ساتھ اس فکری پہلو کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں انفرادی کی بجائے اجتماعی انداز ملتا ہے، وہ اپنی ذات کی بجائے قوم وملت کی بات کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار ﷺ سے اپنی ذات کے لیے کچھ مانگنے کی بجائے اُمتِ مسلم اور اہلِ وطن کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔بعد میں جب اُن کی تحریر کردہ کتاب ''حاضری سے حضوری تک'' کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا جو ملک محمد ممتاز قادری کی عدالتوں میں حاضری سے بارگاہِ رسالت مآب تک حضوری کی رُوداد پر مشتمل ہے، اور جس میں عدالت میں ان کے بطور وکیل صفائی ممتاز قادری کا مقدمہ لڑنے کی ساری کارروائی شامل ہے تو پھر ان کی شخصیت میں کلمۂ حق کا ساتھ دینے کے تمام پہلو مجھ پر روشن ہو گئے۔انہوں نے یہ مقدمہ جن قانونی پہلوؤں سے لڑا اس میں کامیابی یقینی تھی مگر ''اوپر والوں'' کو یہ منظور نہ تھا، اس کتاب میں مقدمہ کی تفصیلی روداد میں ان تمام منافقین اور مصلحت پسندوں کا ذکر بھی ہے جنہوں نے حق کا ساتھ دینے کے بجائے باطل کی قوتوں کا ساتھ دے کر اپنی عاقبت خراب کر لی۔یہ ساری کتاب ہماری عدلیہ اور دیگر اداروں کے علاوہ خود وکلاء کی برادری میں بھی موجود بعض منافقین کا ذکر کرتی ہے۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کا احاطۂ تخلیق محض حمد و نعت تک محدود نہیں ہے انہوں نے ''شمعِ خیال'' جیسا غزلوں کا عمدہ مجموعہ بھی شائع کیا جسے پڑھ کر ان کی ہمہ جہتی کا ایک اور دریچہ مجھ پہ وا ہو گیا کہ شمعِ خیال کی تمام تر شاعری بھی دراصل عودنگر کے صوفیانہ اور وفورِ عشق میں ڈھلے ہوئے عقیدتی اور تفکراتی کلام کا ہی پیش خیمہ ہے، اِس طرح کے کلام کے بارے میں میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ دراصل غزل کے عشقِ مجازی، غزل کے محبوب سے محبت اور ہجر و وصال کے اسلوب میں اپنے محسوسات کا اظہار کرنے والا شاعر ہی حمد ونعت کے کوچے میں اپنا بھرپور اظہار پوری تخلیقی زرخیزیت کے ساتھ کر سکتا ہے۔اس غزل کے مجموعے میں بھی ان کی اسلامی شخصیت اور گستاخانِ رسولؐ کے خلاف جذبہ اوج پر ہے:

جب بھی توہینِ رسالت کوئی گستاخ کرے
کسی ممتاز کو مجرم پہ جھپٹتا دیکھوں

ان کی غزلوں کے مجموعے سے محسوس ہوتا ہے کہ حمد ونعت سے پوری طرح جڑے رہنے کے باوجود ان کی شاعری کا کینوس یہیں تک محدود نہیں بلکہ وہ موجودہ عہد کے تمام مسائل پر بھی غور کرتے اور انہیں موضوع بناتے ہیں جیسا کہ ان کی کتاب ''فکرِ فراواں'' کی منظومات سے ظاہر ہے۔

''فکرِ فراواں'' ان کی فراوانیٔ تخلیق کی گواہی بھی دیتا ہے کہ اُس میں ایک مختلف انداز کا کلام سیاسی، طنزیہ اور مزاحیہ شاعری پر مشتمل ہے، مگر اس میں بھی انہوں نے قوم وملک کے لیے فکر کے کئی دریچے وا کیے ہیں۔اس میں انہوں نے اپنی طویل نظم ''آمر نامہ'' میں بعض فوجی آمروں کے کردار کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو بطور ادارہ فوج کے بارے میں نہیں ہے۔انہوں نے اپنی ایک نظم ''پاک فوج کی وردی'' میں فوج کی جرأت، عظمت اور شان کو بیان کیا ہے۔اسی لیے میں نے اس کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان اشعار کو درست سیاق وسباق میں پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔اس طرح کے شوگر کوٹڈ کلام میں جسٹس صاحب نے ایک فکاہیہ مٹھاس میں وہ تمام تر کڑوی دوا ملا دی ہے جو ہماری قوم کو درپیش شدید معاشرتی، معیشتی اور دیگر بیماریوں کے علاج کے لیے ضروری ہے۔الغرض ان کے مزاحیہ کلام میں بھی سنجیدہ فکر اور اصلاحی پیغامات موجود ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے اس کا عنوان ''فکرِ فراواں'' بہت ہی بھلا لگتا ہے۔

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر جیسی نورانی اور روحانی شخصیت سے ملک وقوم کو بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں کہ وہ اسی طرح قلم کے ذریعے اور اپنے فکری وعلمی خطابات بلکہ جہاد کے ذریعے اس بگڑے ہوئے معاشرے کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔اُن کے لیے میری بہت سی دعائیں کہ وہ یونہی اپنی تخلیقی زرخیزی سے شعری، ادبی اور فکری کائنات کو شاداب کرتے رہیں۔آمین۔

ترکی کا امیر البحر سیّدی علی رئیس

مرزا کاظم رضا بیگ

(ان کا سفرنامہ سندھ کے متعدد اہم واقعات کی نشاندہی کرتا ہے)

سیّدی حسن رئیس ترکی کا امیر البحر تھا، اس کو جہاز رانی میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ بیشتر سیاحت پیشہ افراد اسی سے جہاز رانی سیکھتے اور کھلے سمندر میں مختلف علاقوں کا سفر کرتے تھے۔ اس کے لڑکے سیّدی علی رئیس نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے جہاز رانی کے اصول اور قاعدے سیکھے اور سنہ 960ھ کے لگ بھگ سلطان سلیمان ثانی کی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مصر کا بحری بیڑہ پیری بک کی کمان میں ایک جنگی مہم کے سلسلے میں سوئز سے گزر رہا تھا کہ اچانک سمندر میں طوفان آ گیا اور تباہی پھیل گئی۔ اس طوفان سے اس بحری بیڑے کے کئی جنگی جہاز تباہ ہو گئے۔ باقی رہنے والے جہازوں کو بڑی دشواری کے بعد عدن پہنچنا پڑا۔ جہازوں کی مدد سے پیری بک نے مسقط پر چڑھائی کی اور اُسے فتح کر لیا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ پرتگال کا بحری بیڑہ بھی اِدھر آ رہا ہے۔ جب اُسے خبر ملی تو اس نے تین جہازوں کے ذریعے وہاں سے راہِ فرار لی اور کسی نہ کسی طرح مصر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

ان واقعات کا علم ہونے کے بعد مصری بیڑے کی کمان سیّد علی رئیس کو سونپی گئی اور کہا گیا کہ وہ اس مہم کو سر کرے۔ سیّدی علی رئیس نے اپنی جنگی تیاریاں مکمل کیں، اور جہازوں کو ضروری اسلحہ اور سامان سے لیس کیا اور محرم کے مہینے سنہ 961ھ کو حلب میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے اس نے بصرہ کی طرف توجہ دی اور ماہ صفر سے 961ھ میں یہ منزل بھی سر کر لی۔ اس دوران اس کے چند جہاز خراب ہو گئے۔ اس کو کئی دنوں توقف کرنا پڑا۔ جب اس نے جہازوں کو درست کر لیا تو اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ موسم سازگار ہو تو آگے بڑھے۔ کئی ماہ کے انتظار کے بعد موسم کی حالت تبدیل ہوئی اور ماہِ شوال سنہ 961ھ میں وہ بصرہ سے جاوا پہنچا۔ یہاں اس کو شدید تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی بحری لڑائی تھی۔ جس میں اس کو اپنے ذاتی جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے نا تمام جنگی بحری بیڑے کی مدد سے اپنے سے کئی گنا بڑے اور طاقت ور بحری بیڑے کو شکست دی۔ سیّدی علی رئیس کو گجرات کے حکمرانوں نے ملازمت کی پیش کش کی لیکن گجرات میں تخت نشینی کے مسئلہ پر اس کے دعوے داروں کے درمیان اس قدر اختلاف تھا کہ اس نے گجرات میں رہنے کی بجائے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانے کو ترجیح دی۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اگر اس نے کسی ایک امیر یا دعویدار تخت کی ملازمت کی تو دوسرا دعویدار تخت اس کو راستے سے ہٹانے کے لیے زہر دے گا یا ہلاک کر ڈالے گا۔ چنانچہ اس نے یکم ربیع الاوّل 962ھ کو وہ سندھ کے شہر ہالا پہنچا۔ یہاں اس کو شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض لوگوں نے اس کا راستہ روک لیا اور لوٹ مار کی کوشش کی لیکن اس نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور وہاں سے نکل کر دشت کچھ کو عبور کیا۔ پھر ونگہ کے سفر کی مہم اختیار کی۔ اس مہم کے ختم ہونے پر وہ 26 ربیع الاوّل سنہ 962ھ کو بدین کے نوح میں موضع فتح باغ پہنچا۔

جب سیّدی علی رئیس فتح باغ پہنچا تو اس کو سندھ کی فضا انتہائی دلچسپ اور ماحول خوبصورت دکھائی دیا۔ فتح باغ اس وقت سندھ کی سب سے دلچسپ اور خوبصورت ترین سیرگاہ تھی۔ اسے میرزا شاہ حسن ارغون نے بدین کے قریب آباد دیکھا تھا اور ہمایوں کی آمد کے موقع پر ایک امارت گاہ کی حیثیت دی تھی۔ خوبصورت باغات، خوبصورت نہریں اور خوبصورت مکانات اس علاقے کا حسن بڑھاتے تھے۔ سیّدی علی رئیس کو فتح باغ میں ٹھہرے کچھ ہی روز ہوئے تھے کہ اسے معلوم ہوا کہ میرزا شاہ حسن ارغون کے ایک ترخانی امیر میرزا یحییٰ خان نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور اس کے حامیوں کو قتل کر دیا ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ اس کے آنے سے چند روز پہلے محرم کی ابتدا میں ٹھٹھ کے ارغون نے شاہ حسن سے منحرف ہو کر اعلان کیا کہ وہ اب میرزا یحییٰ خان کی اطاعت کریں گے۔ کیونکہ وہ نیک دل، متقی اور پرہیزگار ہے۔ میرزا یحییٰ خان نے اس صورت حال کو اپنی خوش قسمتی پر محمول کیا اور اس سے راضی ہو گیا کہ اپنے دیرینہ محسن کے خلاف جنگ کرے۔ میرزا یحییٰ خان کو میرزا شاہ حسن ارغون کے امیروں میں کوئی اعلیٰ مقام حاصل نہیں تھا۔ اس کی نشست سب امیروں کے آخر میں تھی۔ اس نے باغیوں کا ایک لشکر تیار کر کے ٹھٹھ مصر نواحی علاقوں میں شدید یورش برپا کر دی۔ اس کے نتیجے میں میرزا شاہ حسن بیگ کے کئی وفادار ساتھی مارے گئے۔ اس کے اہل خاندان پر الگ مصیبت آ گئی۔ اس کا تمام خزانہ نصرپور کے قیام پر لوٹ لیا گیا اور ترخانی امیروں میں مالِ غنیمت کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

یہ صورت حال میرزا شاہ حسن بیگ کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ اس نے فوراً اپنے ایک امیر سلطان محمود خان کو بکھر کا پروانہ عطا کیا اور ہدایت کی کہ وہ تمام باغی امیروں کو گرفتار کر کے اس کے حوالے کر دے۔ سلطان محمود خان نے بکھر کا نظم و نسق سنبھالتے ہوئے تمام باغی امیروں کو گرفتار کر کے میرزا شاہ حسن کے پاس روانہ کر دیا اور 22 محرم سنہ 962ھ کو اسلحہ سے لیس ایک لشکر لے کر شاہ حسن کے پاس اس کی مدد کے لیے پہنچا۔ یہ لشکر جب میرزا شاہ حسن کی نظر سے گزرا تو اُسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس نے اس کی کارگزاری اور وفاداری کو استحسان کی نظر سے دیکھا اور اس کی سرکردگی میں چار سو جنگی کشتیاں میرزا یحییٰ خان کے مقابلے کے لیے بھیجیں۔

ان دنوں سیّد علی رئیس فتح باغ ہی میں مقیم تھا۔ وہ

لحہ بہ لحہ بدلتے ہوئے حالات کو بڑی گہری نظر سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کا ان حالات میں سندھ میں رہنا ممکن بھی ہے یا نہیں، لیکن اس کی مجبوری یہ تھی کہ سندھ سے ہو کر ہی آگے جا سکتا ہے۔ اسی اثنا میں ٹھٹھ سے دو میل دور نالہ سانبا کے مقام پر میرزا عیسیٰ خان اور سلطان محمود خان کے لشکر میں زبردست جنگ ہوئی اور کئی دنوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں طرف کے بہت سے سپاہی اور لشکری مارے گئے۔ جب تباہی پوری طرح پھیل چکی تو میرزا عیسیٰ خان کو احساس ہوا کہ یہ خود اس کے مفاد میں اچھا نہیں ہوگا۔ اس نے مجبوراً مصالحت کر لی۔

سلطان محمود نے نالہ سانبا کے مقام پر اپنے جنگی خیمے نصب کر رکھے تھے۔ یہاں اس کو ترکی کے امیر البحر سیدی علی رئیس کے سندھ میں آنے کی اطلاع ملی اور معلوم ہوا کہ وہ فتح باغ میں مقیم ہے۔ سلطان محمود خان نے فتح باغ پہنچ کر اس سے ملاقات کی اور نہایت دلجوئی اور ہمدردی کے ساتھ اُسے اپنے ہمراہ لے آیا۔ پھر اس کی وساطت سے وہ ربیع الثانی کے شروع میں میرزا شاہ حسن کے لشکر میں پہنچا۔ میرزا شاہ حسن نے اس کی بہادری کے کارنامے سنے تو بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اس کو اس کے شایانِ شان انعام و اکرام مرحمت فرمانے کے علاوہ ایک خلعت فاخرہ بھی دی۔ اس طرح سیّد علی سیدی کو ایک طویل عرصہ کے بعد آرام واطمینان کا سانس لینے کا پہلی مرتبہ موقع ملا۔

ان دنوں سندھ میں عالموں اور صوفیوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ اپنے وعظ و نصیحت سے نہ صرف عوام کی رہنمائی کر رہے تھے، بلکہ ان کی موجودگی سے لوگوں کے رگ و پے میں نہ صرف اسلامی اخوت موجزن تھی بلکہ ہر شخص خود کو سچا اور صالح مسلمان بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سیّدی علی رئیس نے سندھ کو اس قدر مذہبی اور اسلام کا دلدادہ پایا تو خود بخود اس کو خواہش ہوئی کہ وہ یہاں کے چند علماء سے نیاز حاصل کرے۔ اس وقت ٹھٹھ میں شیخ عبدالوہاب پورانی کی خانقاہ مرکز رشد و ہدایت بنی ہوئی تھی۔

شیخ عبدالوہاب پورانی اپنے دور کے سرکردہ اور ممتاز مشائخ میں سے تھے۔ ان کے خصائل حمیدہ اور اطوار پسندیدہ سے آراستہ تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بڑے خوش طبع اور محفل پسند تھے۔ وہ بادشاہوں اور امیروں کو ہر ممکن طریقے پر نصیحت کرتے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی مرتب کی ہوئی جامع فتاوائے پورانی ٹھٹھ اور بکھر میں بہت مشہور تھی۔ سیّدی علی رئیس نے سنہ 962ھ میں شیخ عبدالوہاب پورانی سے ٹھٹھ میں ملاقات کی اور ان سے مختلف علوم و فنون پر تبادلہ خیال کے بعد ان کے بزرگوں کے احوال کے متعلق آگاہی چاہی جو عبدالوہاب پورانی کے جد بزرگوار شیخ میرک کا سلسلہ نسب عرب شاہی سادات سے ملتا ہے۔ ان کی بیوی شیخ جلال الدین بایزیدی پورانی کی صاحبزادی تھیں۔ شیخ میرک فضل و شہادت، زہد اور تقویٰ جیسی اکثر عادات سے ممتاز اور منفرد تھے۔ کئی سال انہوں نے سندھ میں شیخ الاسلام کے عہدہ پر کام کیا۔ ہر آنے جانے والا مسافر ان کا مہمان ہوتا تھا اور ان کا فضل و کرم امیر ہو یا غریب، نووارد ہو یا اجنبی سب پر یکساں ہوتا تھا۔ اس معاملے میں وہ کسی قسم کا امتیاز اور فرق روا نہیں رکھتا تھا۔ اکثر علما و فضلا نے ان سے علومِ دینی کی تحصیل کی تھی اور اس سلسلے میں پایۂ اجتہاد کو پہنچے تھے۔ سیّدی علی رئیس نے شیخ عبدالوہاب پورانی کی ہمراہی میں مکلی جا کر ان کی قبر کی زیارت کی، فاتحہ پڑھی۔ پھر عبالوہاب پورانی بولے جام تماچی اور اصلاح الدین کے عہد کے ایک مشہور بزرگ شیخ حماد جمالی کے مزار پر گئے۔ انہوں نے مکلی میں ایک مسجد بھی تعمیر کروائی تھی اور اس کے متصل ہی اپنا قیام رکھا تھا۔ ان کی وضع قطع بہت سادہ تھی۔ تاریخوں میں لکھا ہوا ہے کہ بادشاہوں نے ان کی دعاؤں اور برکتوں سے اقتدار پایا تھا اور نیک نام ہوئے تھے۔

ٹھٹھ کے بزرگوں اور مشائخوں سے ملاقات کے بعد کافی عرصہ سیّدی علی رئیس نے میرزا شاہ حسین کی ہمراہی میں گزارا۔ یہ زمانہ میرزا شاہ حسن کی پیرانہ سالی کا تھا۔ اس کی صحت بگڑتی جا رہی تھی کہ اسی عالم میں وہ سنہ 962ھ کو کشتی میں بیٹھ کر بھکر پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی اس کی صحت مزید بگڑ گئی۔ طبیبوں کو یقین ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں رہے گا، لیکن وہ اسے تسلی دینے اور زندہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر اس نے 9 جمادی الاوّل سنہ 962ھ کو انتقال کیا۔ چونکہ سیّدی علی رئیس اس کا ہمراہی تھا، وہ اس کی بیماری کی کیفیت سے واقف تھا۔ اس کا بیان ہے کہ حاجی ماہ بیگم نے اسے زہر دلوایا تھا، جو بتدریج اثر کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ سیّدی علی رئیس شاعر بھی تھا، اس نے میرزا شاہ حسن کی تاریخ وفات ترکی زبان میں لکھی، جو ان کی قبر پر کندہ ہے۔

اگرچہ میرزا شاہ حسن بیگ کے ساتھ اس کی وفات چند مہینوں سے زیادہ نہیں رہی تھی، لیکن وہ اس کی علم پروری، بندہ نوازی اور حُسنِ اخلاق و حسن سلوک کا اس قدر گرویدہ ہو گیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا ہونا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اس نے سلطان محمود خان والیٔ بھکر سے اپنے وطن واپس جانے کی اجازت چاہی۔ بہت مشکلوں سے وہ اُسے رُخصت کی اجازت دینے پر راضی ہوا۔ سیّدی علی رئیس نے بھکر سے ملتان اور اُچ کی راہ لی اور وہاں کے بزرگوں کے مزارات سے ہوتا ہوا لاہور کی طرف نکل گیا۔

اپنے قیام سندھ کے دوران سیّدی علی رئیس نے سندھ کے حالات ایک سفرنامے کی شکل میں مرتب کیے ہیں۔ اس سفرنامہ کا نام ''مراۃ الممالک'' ہے۔ اس تاریخ کی ہماری تاریخ میں اس اعتبار سے زیادہ اہمیت ہے کہ اس کے مطالعے سے بعض اہم واقعات کا انکشاف ہوتا ہے، جن تک ہمارے مورخوں کی نظر نہیں گئی ہے یا وہ ان مورخوں کی دسترس سے بہت دور تھے۔ اس سفرنامے کی اس اعتبار سے بھی اہمیت ہے کہ ہم اس کی مدد سے اپنی تاریخ کے بہت سے واقعات کی تصحیح کر سکتے ہیں۔

باغی شاعر- جون ایلیا (جون ایلیا کی سالگرہ کے حوالے سے خصوصی تحریر)

ظفر سیّد

اصلی نام: سید حسین جون اصغر، قلمی نام: جون ایلیا، تخلص: جون، پیدائش: 14 دسمبر 1931ء، امروہہ، وفات: 08 نومبر 2002ء، کراچی، شہریت: پاکستان، برطانوی ہند، زوجہ: زاہدہ حنا پیشہ: ماہر لسانیات، وفلسفی، وشاعر، وادبی تنقید نگار

جون ایلیا (14 دسمبر، 1931ء – 08 نومبر 2002ء) برصغیر میں نمایاں حیثیت رکھنے والے پاکستانی شاعر، فلسفی، سوانح نگار اور عالم تھے۔ وہ اپنے انوکھے انداز تحریر کی وجہ سے سراہے جاتے تھے۔ وہ معروف صحافی رئیس امروہوی اور فلسفی سید محمد تقی کے بھائی اور مشہور کالم نگار زاہدہ حنا کے سابق خاوند تھے۔ جون ایلیا کو عربی، انگریزی، فارسی، سنسکرت اور عبرانی میں اعلیٰ مہارت حاصل تھی۔

سوانح

جون ایلیا 14 دسمبر، 1937ء کو امروہہ، اتر پردیش کے ایک نامور خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد، علامہ شفیق حسن ایلیا کو فن اور ادب سے گہرا لگاو؟ تھا اس کے علاوہ وہ نجومی اور شاعر بھی تھے۔ اس علمی ماحول نے جون کی طبیعت کی تشکیل بھی انہی خطوط پر کی۔ انہوں نے اپنا پہلا اردو شعر محض 8 سال کی عمر میں لکھا۔ اپنی کتاب شاید کے پیش لفظ میں قلم طراز ہیں:

میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے زیادہ اہم اور ماجرا پرور سال تھا۔ اس سال میری زندگی کے دوسب سے اہم حادثے، پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا، یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر کہا:

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

جون اپنے لڑکپن میں بہت حساس تھے۔ ان دنوں ان کی کل توجہ کا مرکز ایک خیالی محبوب کردار صوفیہ تھی۔ وہ ابتدائی مسلم دور کی تاریخ ڈرامائی صورت میں دکھاتے تھے جس وجہ سے ان کے اسلامی تار؟خ کے علم کے بہت سے مداح تھے۔ جون کے مطابق ان کی ابتدائی شاعری اسٹیج ڈرامے کی مکالماتی فطرت کا تاثرتھی۔

ایلیا کے ایک قریبی رفیق، سید ممتاز سعید، بتاتے ہیں کہ ایلیا امروہہ کے سید المدارس کے بھی طالب علم رہے۔ یہ مدرسہ امروہہ میں اہل تشیع حضرات کا ایک معتبر مذہبی مرکز رہا ہے۔ چونکہ جون ایلیا خود شیعہ تھے اس لیے وہ اپنی شاعری میں جابجا شیعی حوالوں کا خوب استعمال کرتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی ذات مبارک سے انہیں خصوصی عقیدت تھی اور انہیں اپنی سیادت پر بھی ناز تھا۔۔ سعید کہتے ہیں، "جون کو زبانوں سے خصوصی لگاو؟ تھا۔ وہ انہیں بغیر کوشش کے سیکھ لیتا تھا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ، جوانہوں نے مدرسہ میں سیکھی تھیں، انہوں نے انگریزی اور جزوی طور پر عبرانی میں کچھ مہارت حاصل کر لی تھی۔

پاکستان آمد

اپنی جوانی میں جون کمیونسٹ خیالات رکھنے کی وجہ سے ہندستان کی تقسیم کے سخت خلاف تھے لیکن بعد میں اسے ایک سمجھوتہ کے طور پر قبول کر لیا۔ ایلیا نے 1957ء ؁ میں پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ جلد ہی وہ شہر کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ ان کی شاعری ان کے متنوع مطالعہ کی عادات کا واضح ثبوت تھی جس کی وجہ سے انہیں وسیع مدح اور پذیرائی نصیب ہوئی۔ جون ایک انتھک مصنف تھے لیکن انھیں اپنا تحریری کام شائع کروانے پر کبھی بھی راضی نہ کیا جا سکا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ شاید اس وقت شائع ہوا جب ان کی عمر 60 سال کی تھی۔ نیازمندانہ کے عنوان سے جون ایلیا کے لکھے ہوئے اس کتاب کے پیش لفظ میں انھوں نے ان حالات اور ثقافت کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے جس میں رہ کر انہیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ یعنی ان کی وفات کے بعد 2003ء میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ بعنوان گمان 2004ء میں شائع ہوا۔ جون ایلیا مجموعی طور پر دینی معاشرے میں علی الاعلان نفی پسند اور فوضوی تھے۔ ان کے بڑے بھائی، رئیس امروہوی کو مذہبی انتہا پسندوں نے قتل کر دیا تھا جس کے بعد وہ عوامی محفلوں میں بات کرتے ہوئے بہت احتیاط کرنے لگے۔ جون ایلیا تراجم، تدوین اس طرح کے دوسری مصروفیات میں بھی مشغول رہے۔ لیکن ان کے تراجم اور نثری تحریریں آسانی سے دستیاب نہ؟ں۔ فلسفہ، منطق، اسلامی تاریخ، اسلامی صوفی روایات، اسلامی سائنس، مغربی ادب اور واقعہ؟ کربلا پر جون کا علم کسی انسائکلو پیڈیا کی طرح وسیع تھا۔ اس علم کا نچوڑ انہوں نے اپنی شاعری میں بھی داخل کیا تا کہ خود کو اپنے ہم عصروں سے نمایاں کر سک؟ں۔

ازدواجی زندگی

جون ایک ادبی رسالے انشاء سے بطور مدیر وابستہ رہے جہاں ان کی ملاقات اردو کی ایک اور انتھک مصنفہ زاہدہ حنا سے ہوئی جن سے بعد میں انھوں نے شادی کر لی۔ زاہدہ حنا اپنے انداز کی ایک ترقی پسند دانشور ہیں اور اب بھی دو روزناموں

''روزنامہ جنگ، پاکستان'' اور ''ایکسپریس'' میں حالات حاضرہ اور معاشرتی موضوعات پر لکھتی ہیں۔ جون کے زاہدہ سے 2 بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوئے۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں ان کی طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد تنہائی کے باعث جون کی حالت ابتر ہوگئی۔ وہ پژمردہ ہوگئے اور انھوں نے شراب نوشی شروع کردی۔

وفات

جون ایلیا طویل علالت کے بعد 08 نومبر، 2002ء کو کراچی میں انتقال کرگئے۔

اردو میں شاعروں کی کوئی کمی نہیں، ایسے حالات میں کسی ایسے شاعر کا اپنا الگ مقام بنالینا حیران کن ہے، جس کا پہلا شعری مجموعہ ان کی زندگی کے 60ویں برس سے پہلے شائع نہیں ہوسکا۔

لیکن دیکھا جائے تو یہ بات اتنی حیران کن بھی نہیں، کیوں کہ جون ایلیا ایک ایسے منفرد اور یگانہ شاعر ہیں جس کا انداز نہ تو پہلے گزرنے والے کسی شاعر سے ملتا ہے اور نہ ہی بعد میں آنے والا کوئی شاعر ان کے لہجے کی تقلید کرسکا۔ وہ اپنے سلسلے کے آپ ہی موجد اور آپ ہی خاتم ہیں۔

جون کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ عشق و محبت کے موضوعات کو اردو غزل میں دوبارہ لے آئے۔ غزل کا روایتی مطلب بے شک 'عورتوں سے باتیں کرنا' ہو، لیکن عالمی تحاریک، ترقی پسندی، جدیدیت، وجودیت اور کئی طرح کے ازموں کے زیر اثر جون ایلیا کی نسل کے بیشتر شاعروں کے ہاں ذات و کائنات کے دوسرے مسائل حاوی ہوگئے۔

جون نے اس کسی حد تک نظر انداز شدہ رومانوی مضامین کو دوبارہ اپنی غزل کا موضوع ضرور بنایا لیکن وہ روایت کے رنگ کے رنگ میں نہیں رنگے، بلکہ انھوں اس قدیم موضوع کو ایسے منفرد انداز سے برتا کہ ان کی آواز پرانی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بیک وقت نئی بھی ہے۔

جون ایلیا 14 دسمبر 1931 کو امروہہ کے ایک علمی اور ادبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بھائی رئیس امروہوی بھی نمایاں شاعر تھے اور انھوں نے جنگ اخبار میں روزانہ قطعہ لکھ کر شہرت حاصل کی۔

جون کے ایک اور بھائی سید محمد تقی تھے جو نامور صحافی گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ جون کے بھانجے صادقین تھے، جو ممتاز مصور اور خطاط ہونے کے ساتھ رباعی کے عمدہ شاعر بھی تھے۔

جون ایلیا کو اقدار شکن، نراجی اور باغی کہا جاتا ہے۔ ان کا حلیہ، طرزِ زندگی، حد سے بڑھی ہوئی شراب نوشی، اور زندگی سے لاابالی رویے بھی اس کی غمازی ہوتی تھی۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس طرزِ زندگی کو اپنے فن کی شکل میں ایسے پیش کیا شخص اور شاعر مل گئے اور کہ من تو شدی و تو من شدی والی کیفیت پیدا ہوگئی۔

تم بنو رنگ، تم بنو خوش بو ہم تو اپنے سخن میں ڈھلتے ہیں

اور اس سخن میں وہ یوں ڈھلے کہ جیسا باغیانہ رویہ انھوں نے دنیا سے اپنایا تھا وہ محبوب سے بھی اختیار کرلیا:

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا؟

یہ روایتی غزل کے شاعر کا مفعولی، شکست خوردہ لہجہ نہیں ہے۔ یہ وہ عاشق نہیں ہے جو محبوب کے سامنے بچھ بچھ جاتا ہے اور اس کے ایک اشارے پر دل، کلیجہ اور جگر نکال کر سامنے دھر دیتا ہے۔ بلکہ اسے محبوب سے 'دھول دھپا' کرنے کے لیے 'عذر مستی' کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی:

اے خوش خرام پاؤں کے چھالے تو گن ذرا
تجھ کو کہاں کہاں نہ گھماتا رہا ہوں میں

یہ شعر اور کون کہہ سکتا تھا؟

یا من، اس کی خاص محرمِ راز
یاد آیا کرے گی اب تو بھی!

محبوب کے ساتھ ان کا بے باکانہ اردو میں بے حد نرالا ہے۔ یہ بے باکی بعض اوقات جارحیت تک میں بدل جاتی ہے۔

اک شخص کر رہا ہے ابھی تک وفا کا ذکر کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

اور اس شعر کا کھلا کھلا ہرجائی پن ملاحظہ ہو:

شاید مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی
لیکن یقین سب کو دلاتا رہا ہوں میں

یہ اشعار نہ صرف اپنے مضمون بلکہ انداز اور اسلوب کے لحاظ سے بھی چونکا دینے والے ہیں۔

جون نے جو بے تکلفانہ اور لاگ لپٹ سے پاک انداز محبوب سے اپنا رکھا تھا، وہ دوسرے موضوعات کو بھی اسی لاٹھی سے ہانکتے ہیں:

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟

اسی غزل کا ایک اور شعر ضرب المثل بن گیا ہے، یا اگر نہیں بنا تو جلد ہی بن جانا چاہیے:

مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا؟

جون نے اپنی زندگی بے حد بے پروائی سے گزاری۔ وہ خود کہتے ہیں:

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم؟

شاید اسی لیے انھوں نے مجرمانہ حد تک اپنی شاعری کی نشر و اشاعت سے پہلو تہی کی۔ لیکن اس کے باوجود دنیا ان کی پروا کرنے پر مجبور ہے اس لیے آج انھیں رزقِ خاک بنے ہوئے دس برس گزر گئے لیکن اردو دنیا ان کی یاد کو اب بھی سینے سے لگائے ہوئے ہے۔

شعری مجموعے

(1) شاید، 1991 (2) یعنی، 2003
(3) گمان، 2004 (4) لیکن، 2006

(5) گویا، 2008 (6) فرنود، 2012
ضبط کر کے ہنسی کو بھول گیا
میں تو اس زخم ہی کو بھول گیا
ذات در ذات ہم سفر رہ کر
اجنبی اجنبی کو بھول گیا
صبح تک وجہ جاں کہی تھی جو بات
میں اسے شام ہی کو بھول گیا
عہد وابستگی گزار کے میں
وجہ وابستگی کو بھول گیا
سب دلیلیں تو مجھ کو یاد رہیں
بحث کیا تھی اسی کو بھول گیا
کیوں نہ ہو ناز اس ذہانت پر
ایک میں ہر کسی کو بھول گیا
سب سے پر امن واقعہ یہ ہے
آدمی آدمی کو بھول گیا
قہقہہ مارتے ہی دیوانہ
ہر غم زندگی کو بھول گیا
خواب ہا خواب جس کو چاہا تھا
رنگ ہا رنگ اسی کو بھول گیا
کیا قیامت ہوئی اگر اک شخص
اپنی خوش قسمتی کو بھول گیا
سوچ کر اس کی خلوت انجمنی
واں میں اپنی کمی کو بھول گیا
سب برے مجھ کو یاد رہتے ہیں
جو بھلا تھا اسی کو بھول گیا
ان سے وعدہ تو کر لیا لیکن
اپنی کم فرصتی کو بھول گیا
بستیو اب تو راستہ دے دو
اب تو میں اس گلی کو بھول گیا
اس نے گویا مجھی کو یاد رکھا
میں بھی گویا اسی کو بھول گیا
یعنی تم وہ ہو واقعی؟ حد ہے
میں تو سچ مچ سبھی کو بھول گیا
آخری بت خدا نہ کیوں ٹھہرے
بت شکن بت گری کو بھول گیا
اب تو ہر بات یاد رہتی ہے
غالباً میں کسی کو بھول گیا
اس کی خوشیوں سے جلنے والا جونؔ
اپنی ایذا دہی کو بھول گیا

....

آپ اپنا غبار تھے ہم تو
یاد تھے یادگار تھے ہم تو
پردگی ہم سے کیوں رکھا پردہ
تیرے ہی پردہ دار تھے ہم تو
وقت کی دھوپ میں تمہارے لیے
شجر سایہ دار تھے ہم تو
اڑے جاتے ہیں دھول کے مانند
آندھیوں پر سوار تھے ہم تو
ہم نے کیوں خود پہ اعتبار کیا
سخت بے اعتبار تھے ہم تو
شرم ہے اپنی بار باری کی
بے سبب بار بار تھے ہم تو
کیوں ہمیں کر دیا گیا مجبور
خود ہی بے اختیار تھے ہم تو
تم نے کیسے بھلا دیا ہم کو
تم سے ہی مستعار تھے ہم تو
خوش نہ آیا ہمیں جیے جانا
لمحے لمحے پہ بار تھے ہم تو
سہہ بھی لیتے ہمارے طعنوں کو
جان من جاں نثار تھے ہم تو
خود کو دوران حال میں اپنے
بے طرح ناگوار تھے ہم تو
تم نے ہم کو بھی کر دیا برباد
نادر روزگار تھے ہم تو
ہم کو یاروں نے یاد بھی نہ رکھا
جونؔ یاروں کے یار تھے ہم تو

اشعار

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

....

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

....

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

....

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا

....

کیسے کہیں کہ تجھ کو بھی ہم سے ہے واسطہ کوئی
تو نے تو ہم سے آج تک کوئی گلہ نہیں کیا

....

علاج یہ ہے کہ مجبور کر دیا جاؤں
وگرنہ یوں تو کسی کی نہیں سنی میں نے

....

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے

....

کتنی دل کش ہو تم کتنا دلجو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

....

اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

....

میری بانہوں میں بہکنے کی سزا بھی سن لے
اب بہت دیر میں آزاد کروں گا تجھ کو

....

کیا کہا عشق جاودانی ہے!
آخری بار مل رہی ہو کیا

....

کیا ستم ہے کہ اب تری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

میں رہا عمر بھر جدا خود سے
یاد میں خود کو عمر بھر آیا

زندگی کس طرح بسر ہوگی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

اپنا رشتہ زمیں سے ہی رکھو
کچھ نہیں آسمان میں رکھا

کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو

اب جو رشتوں میں بندھا ہوں تو کھلا ہے مجھ پر
کب پرند اڑ نہیں پاتے ہیں پروں کے ہوتے

سوچتا ہوں کہ اس کی یاد آخر
اب کسے رات بھر جگاتی ہے

تمہارا ہجر منا لوں اگر اجازت ہو
میں دل کسی سے لگا لوں اگر اجازت ہو

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

اپنے سب یار کام کر رہے ہیں
اور ہم ہیں کہ نام کر رہے ہیں

یاد اسے انتہائی کرتے ہیں
سو ہم اس کی برائی کرتے ہیں

اب مری کوئی زندگی ہی نہیں
اب بھی تم میری زندگی ہو کیا

بن تمہارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمہاری ہے

ہر شخص سے بے نیاز ہو جا
پھر سب سے یہ کہہ کہ میں خدا ہوں

کام کی بات میں نے کی ہی نہیں
یہ مرا طور زندگی ہی نہیں

شب جو ہم سے ہوا معاف کرو
نہیں پی تھی بہک گئے ہوں گے

اور تو کیا تھا بیچنے کے لئے
اپنی آنکھوں کے خواب بیچے ہیں

مجھ کو عادت ہے روٹھ جانے کی
آپ مجھ کو منا لیا کیجے

اک عجب حال ہے کہ اب اس کو
یاد کرنا بھی بے وفائی ہے

یہ بہت غم کی بات ہو شاید
اب تو غم بھی گنوا چکا ہوں میں

آج مجھ کو بہت برا کہہ کر
آپ نے نام تو لیا میرا

جان لیوا تھیں خواہشیں ورنہ
وصل سے انتظار اچھا تھا

مجھے اب تم سے ڈر لگنے لگا ہے
تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی کیا

زندگی ایک فن ہے لمحوں کو
اپنے انداز سے گنوانے کا

اب تو ہر بات یاد رہتی ہے
غالباً میں کسی کو بھول گیا

کتنے عیش سے رہتے ہوں گے کتنے اتراتے ہوں گے
جانے کیسے لوگ وہ ہوں گے جو اس کو بھاتے ہوں گے

ایک ہی تو ہوس رہی ہے ہمیں
اپنی حالت تباہ کی جائے

دل کی تکلیف کم نہیں کرتے
اب کوئی شکوہ ہم نہیں کرتے

ہم کو یاروں نے یاد بھی نہ رکھا
جون یاروں کے یار تھے ہم تو

جرم میں ہم کمی کریں بھی تو کیوں
تم سزا بھی تو کم نہیں کرتے

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

یارو کچھ تو ذکر کرو تم اس کی قیامت بانہوں کا
وہ جو سمٹتے ہوں گے ان میں وہ تو مر جاتے ہوں گے

اپنے سر اک بلا تو لینی تھی
میں نے وہ زلف اپنے سر لی ہے

خرچ چلے گا اب مرا کس کے حساب میں بھلا
سب کے لئے بہت ہوں میں اپنے لئے ذرا نہیں

وہ جو نہ آنے والا ہے نا اس سے مجھ کو مطلب تھا
آنے والوں سے کیا مطلب آتے ہیں آتے ہوں گے

کیا تکلف کریں یہ کہنے میں
جو بھی خوش ہے ہم اس سے جلتے ہیں

اب تو اس کے بارے میں تم جو چاہو وہ کہہ ڈالو
وہ انگڑائی میرے کمرے تک تو بڑی روحانی تھی

کوئی مجھ تک پہنچ نہیں پاتا
اتنا آسان ہے پتا میرا

آج بہت دن بعد میں اپنے کمرے تک آ نکلا تھا
جوں ہی دروازہ کھولا ہے اس کی خوشبو آئی ہے

اے شخص میں تیری جستجو سے
بے زار نہیں ہوں تھک گیا ہوں

ساری دنیا کے غم ہمارے ہیں
اور ستم یہ کہ ہم تمہارے ہیں

تمہاری یاد میں جینے کی آرزو ہے ابھی
کچھ اپنا حال سنبھالوں اگر اجازت ہو

جانیے اس سے نبھے گی کس طرح
وہ خدا ہے میں تو بندہ بھی نہیں

میری ہر بات بے اثر ہی رہی
نقص ہے کچھ مرے بیان میں کیا

جاتے جاتے آپ اتنا کام تو کیجے مرا
یاد کا سارا سر و ساماں جلاتے جایئے

ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر مرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی

ایک ہی حادثہ تو ہے اور وہ یہ کہ آج تک
بات نہیں کہی گئی بات نہیں سنی گئی

نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم
بچھڑنا ہے تو جھگڑا کیوں کریں ہم

میں جو ہوں جون؟ ایلیا ہوں جناب
اس کا بے حد لحاظ کیجیے گا

ہم کہاں اور تم کہاں جاناں
ہیں کئی ہجر درمیاں جاناں

اس کے ہونٹوں پہ رکھ کے ہونٹ اپنے
بات ہی ہم تمام کر رہے ہیں

مجھ سے اب لوگ کم ہی ملتے ہیں
یوں بھی میں ہٹ گیا ہوں منظر سے

ہیں دلیلیں ترے خلاف مگر
سوچتا ہوں تری حمایت میں

اتنا خالی تھا اندروں میرا
کچھ دنوں تو خدا رہا مجھ میں

گنوائی کس کی تمنا میں زندگی میں نے
وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی میں نے

یہ وار کر گیا ہے پہلو سے کون مجھ پر
تھا میں ہی دائیں بائیں اور میں ہی درمیاں تھا

رویا ہوں تو اپنے دوستوں میں
پر تجھ سے تو ہنس کے ہی ملا ہوں

بولتے کیوں نہیں مرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا

داد و تحسین کا یہ شور ہے کیوں
ہم تو خود سے کلام کر رہے ہیں

آخری بات تم سے کہنا ہے
یاد رکھنا نہ تم کہا میرا

تو کیا سچ مچ جدائی مجھ سے کر لی
تو خود اپنے کو آدھا کر لیا کیا

اب تم کبھی نہ آؤ گے یعنی کبھی کبھی
رخصت کرو مجھے کوئی وعدہ کیے بغیر

ہماری ہی تمنا کیوں کرو تم
تمہاری ہی تمنا کیوں کریں ہم

کیا ہے جو بدل گئی ہے دنیا
میں بھی تو بہت بدل گیا ہوں

ہمارے زخم تمنا پرانے ہو گئے ہیں
کہ اس گلی میں گئے اب زمانے ہو گئے ہیں

جسم میں آگ لگا دوں اس کے
اور پھر خود ہی بجھا دوں اس کو

نہیں دنیا کو جب پروا ہماری
تو پھر دنیا کی پروا کیوں کریں ہم

مل رہی ہو بڑے تپاک کے ساتھ
مجھ کو یکسر بھلا چکی ہو کیا

پڑی رہنے دو انسانوں کی لاشیں
زمیں کا بوجھ ہلکا کیوں کریں ہم

آئینوں کو زنگ لگا
اب میں کیسا لگتا ہوں

زندگی کیا ہے اک کہانی ہے
یہ کہانی نہیں سنانی ہے

اور کیا چاہتی ہے گردش ایام کہ ہم
اپنا گھر بھول گئے ان کی گلی بھول گئے

چاند نے تان لی ہے چادر ابر
اب وہ کپڑے بدل رہی ہوگی

خموشی سے ادا ہو رسم دوری
کوئی ہنگامہ برپا کیوں کریں ہم

یہ کافی ہے کہ ہم دشمن نہیں ہیں
وفا داری کا دعویٰ کیوں کریں ہم

حاصل کن ہے یہ جہان خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

خوب ہے شوق کا یہ پہلو بھی
میں بھی برباد ہو گیا تو بھی

کون سے شوق کس ہوس کا نہیں
دل مری جان تیرے بس کا نہیں

اپنے اندر ہنستا ہوں میں اور بہت شرماتا ہوں
خون بھی تھوکا سچ مچ تھوکا اور یہ سب چالا کی تھی

حالات کی دہلیز پہ

عبدالوحید بسمل

یوں تو ہر کتاب بلکہ ہر تحریر یہ حق محفوظ رکھتی ہے کہ اسے پڑھا جائے، سمجھا جائے، اسکے باطن میں کارفرما جذبے کی تہہ میں جھانک کر اسکی گہرائی اور اسکے حصارِ احساس میں رہ کر گیرائی اور گرفت کا اندازہ لگایا جائے اور سب سے بڑھ کر، اس کی افادیت برائے انسان و انسانیت کا تعین کیا جائے۔ مگر قاری کے بھی اپنے کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کا جائز استعمال کر کے وہ کسی بھی کتاب، فن پارے، یا تحریر کو لائقِ توجہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ میرے نزدیک اس بات کا فیصلہ تو قاری کسی کتاب یا تحریر کے عنوان، مندرجات کی فہرست اور پھر اسکے ابتدائی چند صفحات کے مطالعے پر ہی آسانی سے کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانے کے ادبی و شعری تلاطم میں بے شمار کتابیں نقاب کشائی کے مرحلے سے گزر کر گوشہ نشیں ہوتی دیکھی جاسکتی ہیں مگر جن کتابوں اور تحریروں میں سماجی شعور کی نئی جہتوں کا جلوہ افروزی، معاشرتی و آفاقی اقدار اور رویوں کے منفی رجحان پر اعلیٰ اخلاقی پرتوں میں لپٹی ضرب کاری، شعری تخلیقات کی صورت میں وارداتِ قلبی اور وجدانی کیفیات کا لفظی پیکروں میں ڈھلنا، حسنِ جمالیات کا بالغانہ اظہار، احساسات و جذبات کا والہانہ ظہور، مشاہدات و تجربات کی تعمیقی بازگشت، تخیلاتی برتری اور تخلیقی مواد کی انفرادیت، افکار کی بالیدگی، اچھوتا اسلوب بیاں، موضوعات کا تنوع اور قوافی و ردائف سے پورا پورا انصاف اور استفادہ موجود ہو وہ ایک حوالہ بن کر ادبی و علمی دنیا میں اپنا مقام بنا لیتی ہیں۔ اور انہی اوصاف سے بھرپور معروف شاعر ڈاکٹر محترم شمیم آزر کا خوبصورت شعری مجموعہ ”خواب خواب اندیشے“ کے نام سے پیارے دوست حسن عباسی کے توسط سے بصد شکریہ موصول ہوا۔ اور موضوعِ مضمون ٹھہرا۔

جنابِ شمیم آزر کے تعارفی حوالے سے بہت کچھ لکھنا اس مضمون کی بنیادی ضرورت سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ جو تخلیق کار اپنی عمرِ عزیز کے مختلف ادوار میں کم و بیش پانچ ملکوں کی ہجرت کے باوصف مختلف معاشروں، تہذیبوں اور زبانوں کے تفاوت کو اپنی چشمِ بینا سے دیکھ چکا ہو، اس کی فہم و فراست اور تخلیقی رجحان اور سلیقہ بیان کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر انھوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں یہ کام خود سرانجام دے کر یہ مشکل حل کر دی ہے۔ لہٰذا مختصراً اتنا کافی ہے کہ انہوں نے گورکھپور یوپی میں آنکھ کھولی اور صرف دو سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ اس وقت کے مشرقی پاکستان کے ٹھاکر گاؤں ہجرت کی جہاں ان کا بچپن اور اوائل جوانی کے تیرہ سال گزرے۔ پھر انہوں نے دوسری ہجرت کی اور ۱۹۶۸ء میں کراچی تشریف لے آئے جہاں ان کے بڑے بھائی قیام پذیر تھے۔ یہاں آکر انہوں نے اسلامیہ سائنس کالج سے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا اور پھر ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے فارغ التحصیل ہو کر ماہر امراض کان، ناک اور حلق بن گئے مگر ساتھ ساتھ شعری اور ادبی محافل میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ ملک کے مایہ ناز شعرا سے ملاقاتیں بھی رہیں اور ریڈیو پاکستان کراچی کے مشہور ادبی پروگرام ”بزم طلبہ کراچی“ سے وابستگی نے ان کے ادبی ذوق کو مزید جلا بخشی۔ ۱۹۹۶ء میں انہوں نے تیسری ہجرت کی اور ملائشیا چلے گئے جہاں انہوں نے کافی عرصہ گزارا اور پھر ۲۰۱۵ء میں ایک اور ہجرت کی ٹھان لی اور اپنی فیملی سمیت کینیڈا چلے گئے اور اب وہ امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ اُن کی ان یکے بعد دیگرے ہجرتوں کی وجہ سے ان کی شعری تخلیقات میں وسعتِ نظری اور مختلف النوع موضوعات اور عالمانہ طرزِ فکر کا ہونا از خود ایک دلیل بن جاتا ہے۔

ان کے زیرِ نظر شعری مجموعے کے مشمولات تو ایک الگ دقیق تنقیدی و توصیفی مقالے کے متقاضی ہیں تاہم فی الوقت اس مختصر سے مضمون پر اکتفا کرتے ہوئے اتنا کہا جاتا ہے کہ جناب شمیم آزر ایک ماہر طبی معالج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ تخلیق کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جن کی شعری بُنت ایک اپنا مزاج اور اسلوب رکھتی ہے۔ جنابِ آزر اپنی اس شعری کاوش کو ابتدا ہی سے ایک الگ پہچان اور شناخت دیتے نظر آتے ہیں۔ کتاب کے ٹائٹل پر ہی غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے معاملات میں کس قدر عمیق النظری کے حامل ہیں۔ خواب سہانے۔۔ خواب خیال۔۔ خواب اور حقیقت۔۔۔ خواب در خواب۔۔ اور اسی طرح کے کئی اور نام تو اکثر دیکھنے سننے میں آتے رہتے ہیں مگر ” خواب خواب اندیشے“ جیسا ٹائٹل بذاتِ خود ایک دعوتِ فکر کا استعارہ بن کر جھلکتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نہ صرف اپنی ذات واحوال کے حوالے سے کچھ کہنا لکھنا چاہتے ہیں بلکہ ان کی فراست کائنات کی وسعتوں میں پھیلے، انسانی زندگی کے خواب اور ان خوابوں کی تعبیر کو لاحق اندیشوں تک

رسائی رکھتی ہے۔ اور پھر ان اندیشوں سے نبرد آزما ہونے کے تیر بحدف نسخوں کی نامیاتی ساخت اور بافندگی سے بھی آشنا ہے۔ اسی لیے تو ان کی شاعرانہ روش میں ایک عام انسان کے خوابوں سے لیکر آفاقی معاملات اور رویوں کے تناظر میں دیکھے جانے والے خوابوں کا تصور اور اہلِ سطوت کی جانب سے ان کی تعبیر کو درپیش اندیشوں کے شعری پیکر بھی ملتے ہیں اور الفاظ کو نئے انداز اور معانی کا جامہ پہنے عمدہ و اعلیٰ شعری مرقعے بھی۔

جناب شمیم ایک باہمت اور سچے عاشقِ فطرت کے طور پر ہمیں اوائل عمری سے ہی شعری افق پر دکھائی دیتے ہیں کہ انہوں نے جس گاؤں میں اپنا بچپن گزارا اس کی یاد ابھی تک ان کے ذہن رسا سے محو نہیں ہوئی:

اک شہر تھا بسا ہوا خواب و خیال میں
گم ہو کے رہ گیا ہے ماہ و سال میں
گاؤں کی وہ ندی وہ درختوں کے سلسلے
مبہم سے کچھ نقوش خیالوں کے جال میں

ایک طبی ماہر معالج ہونے اور فنی باریکیوں پر دسترس رکھنے کے باوجود جناب شمیم نے اپنے شعری سفر میں صرف اشعار کی خارجی حیثیت کو ہی وقعت نہیں دیا بلکہ شعر گوئی کے اس عمل میں فکر اور فن کی آمیزش کے ساتھ ساتھ ان کی نامیاتی ساخت پر بھی خصوصی نظر رکھی ہے۔ بدیں وجہ ان کی شاعری کا نکھار اپنے فطری وجود کے باعث اہلِ علم و دانش اور صاحبانِ نقد و نظر کے لیے دلیلِ ہست کا سامان مہیا کرتا نظر آتا ہے۔

ان کے کلام کی بنیادی خصوصیت اس کا موضوعاتی تنوع اور اسلوب کی پرکاری ہے۔ وہ جذبے کو فکر کی بھٹی سے یوں گزارتے ہیں کہ ایک منفرد امیجری وجود پذیر ہوتی ہے جو محض جمالیاتی تسکین کا باعث ہی نہیں بنتی بلکہ جذبات میں ہلچل مچا دینے کا کام بھی کرتی ہے۔ جناب آزر کے ہاں آرتھوڈاکسین طرزِ فکر اور کالعدم رسومات کی پیروی کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ وہ تخلیقی سطح پر ایک جدید فکر و نظر کے حامل اور رجائیت پسند پُرعمل زندگی کے قائل نظر آتے ہیں۔

پھر کسی نے درِ احساس پہ دستک دی ہے
پھر کوئی گونج اٹھی ، ذہن کے ویرانے میں

....

اب اصولوں کے وہ سارے سائباں جل کر ہیں راکھ
زندگی کا یہ ہنر کل تک ہمیں آتا نہ تھا

....

اک دن ضبط کے سارے بندھن آزر! ٹوٹ جاتے ہیں
اندر جو طوفان چھپا ہو باہر آ جاتا ہے

....

کاش تعبیر میں تنہائی نہ کاٹیں آزر!
دل کے صحراؤں میں پھر خواب ہیں بوئے اب کے

جناب آزر جہاں رجائیت کا علم تھامے ترقی پسندانہ مزاج رکھتے ہیں وہیں وہ مصائب عالم میں جکڑی انسانیت کے دکھوں اور تکالیف کے درد اور کربِ زیست کے دلخراش مناظر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ شاید انہیں استبدادی اور استعماری سوچ اور طرزِ عمل سے بھی خوب آشنائی ہے۔ جن کی وجہ سے انسانی سوچ اور فرد کی شخصیت اپنی نمو اور بالیدگی کے جملہ لوازمات سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ اور یہ احساس کی وہی شدت ہے جس کو خون کے ہیجان خیز بلبلے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہی شدت احساس جناب آزر کی آزادانہ طبیعت کی غماز ہے جو آگے چل کر عالمی تناظر میں سوسایٹی کے رویوں کی کارگزاری پر نوحہ کناں بھی ہے اور ضمیرِ عالم کو جھجھوڑتی بھی ہے۔

چند قطرے تو بڑھا دیتے ہیں اور بھی پیاس
گر نہ ہو کھل کے برسنا تو نہ برسے اب کے

....

برا نہ مان کہ ہم ایسے سرد مہر نہ تھے
بھلا دیئے ہیں غمِ زیست نے ترے آداب

....

موت! صرف ایک اذیت کے تسلسل سے نجات
زندہ رہنے کے عذابوں سے گزر کر دیکھ

....

ہو جو سکتی منافقت آزر!
ہم بھی شاہوں کے ہم نشیں ہوتے

....

پرندے قید سے آزاد ہو کر
کھلے موسم میں مرنا چاہتے ہیں

جناب شمیم آزر کے مندرجہ بالا اشعار جس شدت احساس میں ڈوب کر انسان کی انفرادی طور پر دیکھی اور برداشت کی جانے والی مجبوریوں اور پریشانیوں کا نقشہ کھینچتے ہیں وہیں انہیں مجموعی طور پر انسانیت کا کرب بھی اسی شدت اور وارفتگی کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ ان کے دل، میں انسانیت کا وہ تصور ہے جس کی اساس انسانی برابری اور مساویانہ حقوق کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ہنستا مسکراتا اور آسودہ زندگی گزارتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی سوچ، فکر اور مشاہدات کا زاویہ مقامیت سے کہیں اوپر ہے اور ہمہ وقت آفاقی تناظر میں محو پرواز ہے۔ جبر و استبداد کی فضا چاہے فلسطین اور یوکرائین میں ہو یا افغانستان میں، کشمیر میں ہو یا برما میں وہ ہر انسان کے دکھ کو برابر محسوس کرتے نظر آتے ہیں اور پھر آفاقی سکون اور آسودگی کی تڑپ میں اپنے قلم کو یوں جنبش دیتے ہیں کہ وہ پکار اٹھتا ہے۔

موجِ حالات سے پیہم الجھتی ہوئی زیست
پوچھتی ہے کہ تلاطم سے ابھرنا کب ہے؟

....

ہر چند کہ چہرے پہ نہیں کرب کے اثرات
اندر سے ہر اک شخص مگر ٹوٹ رہا ہے

....

اُجڑے ہوئے اس گھر کی ہر چیز پہ وحشت ہے
جس حال میں زندہ ہوں جینا بھی اذیّت ہے

....

خاک ہونے کو ہے ایوانِ جہالت کا غرور
قصرِ انصاف کی زنجیر ہلاتے رہیے

جنابِ آزر کا یہ آفاقی اسودگی اور سکونِ عالم کا نظریہ اپنی جگہ مگر ان کے حصارِ بصارت میں اپنی عظمتِ رفتہ کے اعصاب شکن مناظر بھی موجود ہیں اور قومی بے حسی اور نااندیشی کی کوکھ سے جنم لینے والے المیوں کی روداد الم بھی۔ انہیں اپنی تاریخ سے بھی آگاہی ہے اور علمی و تحقیقی میدان میں پست روی کا روگ بھی۔ اس خصوص میں کہیں تو وہ ایک عمدہ مبصر کے روپ میں نظر آتے ہیں اور کہیں ایک اُجڑی نگری کے پاسبانوں کی صف میں کھڑے نوحہ کناں۔ کہیں وہ خود کو بطورِ استعارہ پیش کرتے ہوئے اس اجاڑ اور تباہی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کہیں مجموعی کج روی پر تاسف کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

الزام کیسے دوں میں کسی اور کو بھلا؟
میں جب کہ خود شریک ہوں اپنے زوال میں

....

دنیا تو جا چکی مہہ و خورشید سے پرے
اُلجھے ہوئے ہیں آپ ستاروں کی چال میں

....

جاں نذر کی جس کے لیے اجداد نے اپنے
ہم سے وہ کھلونا تو مگر ٹوٹ گیا ہے

مزے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار جذبات میں اس قدر بہادر اور نڈر ہیں کہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اسے بلاکم وکاست بیان بھی کر دیتے ہیں۔ اور پھر اس بات کا اعلان بھی خود اس دلیری اور بے خوفی سے کرتے ہیں کہ رشک آتا ہے۔

دنیا کو پسند آئیں نہ آئیں میری باتیں
جس بات کو محسوس کیا میں نے لکھا ہے

اور اسی کے ساتھ وہ اپنے آپ سے بھی معرکہ آرائی پر تیار ہیں۔ یہاں اگر خود احتسابی اور ذات سے جنگ کی بات کی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مگر اپنے آپ سے جنگ کوئی معمولی سوچ اور فکر کی بات نہیں اس کے لیے برسوں کی ریاضت اور جواز کی تلاش میں رہنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ سے جنگ وہی کر سکتا ہے جس کو عرفان ذات ہو۔ جو اپنے اندر کی کیفیات، باہر کے مد و جذر اور زمانے کے بدلتے تقاضوں سے بھی پوری طرح آشنا ہو اور ضمیر کے فیصلوں کے ساتھ فہم اور فراست کی مدد سے نبرد آزما ہونے کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ اور یقیناً جنابِ آزر اس قضیے کو جانتے ہیں جبھی تو وہ کہتے ہیں کہ:

عمر بھر ختم ہو نہیں پائی
خود سے جاری محاذ آرائی
اجنبیت کچھ اور بڑھ گئی
زندگی جس قدر قریب آئی

....

کیا خزانے ہیں ابھی ذات میں اپنی نایافت
ایک بار اپنی طرف بھی تو سفر کر دیکھو

جناب شمیم آزر اگرچہ ملکوں ملک پھر چکے ہیں۔ مگر ان کے من میں اپنے وطن اپنے گھر، اپنے مسکن اور اپنے مستقل ٹھکانے کی خواہش ایک بگولے کی طرح بلک رہی ہے۔ یہاں مجھے کہنے دیجیے کہ جنابِ آزر کسی عام سوچ کے بندے نہیں ورنہ آج کے اس مادہ و مرتبہ پرستی کے دور میں ہر کوئی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں جا کر رہنا اپنے لیے وقار اور فخر کا باعث سمجھتا ہے جب کہ جنابِ شمیم اپنی ان اوپر تلے کی ہجرتوں سے نالاں ہیں۔ اس حوالے سے ان کی اس کتاب میں متعدد ایسے اشعار موجود ہیں جن میں غریب الوطنی کے کرب کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور ان کی اپنے وطن سے والہانہ محبت اور دیارِ غیر سے اکتاہٹ بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔ جس پر وہ مستحق دادو تحسین بھی ہیں اور لائق ستائش بھی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

اب اپنے شہر کے سب لوگ یاد آتے ہیں
کسی کے در پہ ٹھہرتے کسی کے گھر رہتے

....

کہاں تھا حوصلہ آزر کہ ساتھ دیتے لوگ
تمام عمر مری طرح در بدر رہتے

....

پہچان سکے کوئی نہ آواز دے کوئی
اس شہر میں جینے کا بھی اپنا مزہ ہے

....

خود اپنے ہاتھوں سے دنیا بکھیر کر اپنی
دیارِ غیر میں آباد ہونا چاہتے ہو؟

....

جنابِ آزر کے کلام کے دیگر محاسن کے ساتھ ساتھ اگر ان کی غزل گوئی کا ناقدانہ جائزہ پیش نہ کیا جائے تو بات نہیں بنتی۔ کیونکہ انہوں نے روایت پسندی کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جدت

طرازی کو بھی فراموش نہیں کیا۔ پھر زبان و بیاں کی خوبیاں اپنا واضح اعلان کرتی دکھائی دیتی ہیں اس پر طرہ یہ کہ مختلف بحور اور اوازان کے عمدہ امتزاج اور سہل پسندی نے ان کی غزل میں سہل ممتنع اور ابلاغ کی عمدگی کے ساتھ ساتھ استادانہ رنگ بھی نمایاں کر دکھایا ہے۔ موضوعات کی فراوانی تو گویا ان کے ہاں کسی دقیق بن میں خودرو پھولوں کی طرح ناظر کی چشمِ عام کو چشمِ بینا بنا دینے پر دسترس رکھتی ہے۔ پھر صنائع اور بدائع کا جا بجا بے ساختہ استعمال ان کے کلام کو الگ رفعت اور توانائی بخشتا ہے۔ جذبے کے اظہار میں مناسب ترین اور پر تاثیر الفاظ کا چناؤ اور ان کا ماہرانہ دروبست قابل ستائش ہی نہیں لائق تقلید بھی ہے۔ پھر اچھوتی ردائف کے استعمال سے عام قوافی کی خصوصی اور نئی نئی معنوی پرتیں کھولنا ایک امتیازی حسن کا اہتمام نظر آتا ہے۔ جناب آزر نے اپنی غزل میں جو لکھا ہے وہ کسی خاص تناظر میں لکھا ہے جس کی وجہ سے وہ شاعری میں عامیانہ روش سے ہٹ کر مقصدیت کی روایت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ پھر ایک اور خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے پورے کلام میں بھرتی کے شعر اور کسی بھی شعر میں بھرتی کے الفاظ سے پہلو بچا کر اردو ادب میں ایک خوبصورت اضافے کا اہتمام کر دکھایا ہے ان حوالوں سے ان کا جملہ کلام ہی بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے تاہم نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دور ہی رہے تجھ سے، ترے شہر سے ہم
خوف آتا تھا تری راہ گزر سے، اب کے

....

جگمگاتے ہیں در و بام، مہکتی ہیں رُتیں
کون گزرا تری مانند ادھر سے، اب کے

عجیب غرور تھا دل کو تری رفاقت کا
یقین ہی نہیں آیا ترے بچھڑنے تک

....

اس نے پھر رکھی ہیں تضاد کی شرطیں
اور انکار کی صورت بھی نہیں ہے شاید

....

تری آنکھوں میں یہ پھیلی ہوئی رُت
پھر سے جی اٹھنے کا سامان کیے دیتی ہے

....

جس نے دیے ہیں زخم وہ پوچھتا بھی ہے
باقی ہے کتنا وقت ابھی اندمال میں

....

ہم کو معلوم نہیں عہدِ وفا، پاسِ وفا
تیرے رستے میں بتا! جاں سے گزرنا کب ہے

....

میرے رشتے، میرے تعلق سب
یا تو ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے

اور اسی نوعیت کے لاتعداد اشعار اس مجموعے کی اہمیت کو چار چاند لگاتے ہوئے اپنی موجودگی پر رقصاں ہیں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی کیونکہ اس کتاب میں جناب آزر کی متعدد دل آویز نظمیں بھی شامل ہیں۔ نظم گوئی میں جس تدقیق اور وسیع النظری کی ضرورت ہوتی ہے جناب شمیم آزر کے پاس اس کا عمدہ اور مضبوط اہتمام موجود ہے۔ اجمالی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نظم میں ساخت اور موضوع میں ایک ایسی نامیاتی وحدت موجود ہے جس میں فن کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنے کناروں پہ کھڑے صاحبانِ شوق اور اہلِ نظر کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ ان کی نظموں میں انسانی جبلتوں کے سائے میں پلنے والے بے قرار جذبوں کی گونج بھی سنائی دیتی ہے اور حالات کے ستم ظریف نشتر کی تیز دھار سے کٹے احساسات کی چیخ و پکار بھی۔ ان کی نظموں میں انسانی نفسیات سے جنم لینے والے جذبوں کی روانی بھی ہے اور مجبور و مقہور انسانیت کی سوچ اور فکر میں جاں گزیں ڈر اور خوف کا سایہ بھی۔ ان کی نظموں کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اس میں انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ زندگی کی چھوٹی بڑی خوشیاں اور دکھ، تجسس اور آرزو، تمنا اور حسرت، ایذا اور مداوا، ندا اور صدا غرضیکہ انسان کی قلبی واردات و خارجی کیفیات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جناب آزر کی شعری اڑان اس شاہین کی مانند ہے جو فضاؤں میں بلند پروازی کا خوگر ہے جو مشکل ترین اور خطرناک چٹانوں کا باسی ہے مگر بلا کی بصارت اور حیران کن جوش اور طاقت کا استعارہ ہے۔ اور آزر کی اس شاہینی شعری اڑان میں ان کی پیشہ ورانہ مہارتوں نے مسیحائی کا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا ہے اور انواع و اقسام کے معاشرتی و تہذیبی تفاوت اور امتزاج کے مشاہدات و تجربات نے انہیں حالات کی دہلیز پر بیٹھے مجبور و بے بس رشتوں کے جھلسنے سے پیدا ہونے والے تعفن کے جان لیوا اثرات سے انسانیت کو بچانے کے لیے نئے موسموں اور نئی رتوں کی تازہ ہوا سے ویکسین کشید کر کے اسے اپنے شعری پیکروں میں ڈھال کر ضرورت مندوں کے لیے پیش کر دیا ہے کیونکہ جناب شمیم آزر جانتے ہیں کہ:

حالات کی دہلیز پہ جھلسے ہوئے رشتے
موسم کی نئی رُت سے ہوا مانگ رہے ہیں

دی فادر، دی سن اینڈ دی ہولی گھوسٹ: ایک تعارف

ڈاکٹر عادل سعید قریشی

فرحین خالد کی توسط سے ملنے والا ناولٹ ''دی فادر، دی سن اینڈ دی ہولی گھوسٹ'' پڑھنے کو ملا، ایک نشست میں پڑھ ڈالا۔ مجھے اوروں کا معلوم نہیں میں جب بھی کوئی کتاب پڑھنے کے ہاتھ میں تھامتا ہوں تو خالی الذہن نہیں رہ سکتا کچھ نہ کچھ اندازے لگالیتا ہوں جو عموماً غلط ہی ثابت ہوتے ہیں۔ قیصر نذیر خاور کا اردو ناولٹ ہاتھ میں لیا تو سارہ اور میتھیو کے دو بیانیوں نے خوشگوار حیرت سے ہم کنار کیا اور بس پھر رہا نہ گیا تا وقتیکہ اس کے آخری جملے کو پڑھ کر حیرت و استعجاب میں کھڑا رہ گیا۔ اور اب الٹا اسی ناولٹ کو اپنے دل ہی دل میں دہرانے لگا۔ کہانی نادر، بیان پختہ، اسلوب البیلا، کہانی سلگتی ہوئے، حقائق مسلمہ، نفسیات اجزا مجتمع، مصنف عنقا، کردار مضبوط اور میرے محلے دار، ایمائیت اوج پر، جامعیت محیطوی، تلخیاں اور گھلاوٹ کا مقیاس مساوی، کہانی کی روانی میرے کنہار کے بہاؤ جیسی، اخفاء عروج پر تو پھر کون کافر ہو گا جو اس ناولٹ کو مکمل کیئے بنا چھوڑ دیتا۔ ہاں میں نے بھی آخر میں لکھے تاثرات اور آرا کو در خور اعتنا نہ جانا کہ میں اس کہانی کو اپنی نگاہ سے دیکھ چکا تھا، قیصر نذیر خاور (تین ناموں والا کہانی کار) میرے دل میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔

کہانی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک طویل افسانہ معلوم ہوتی ہے، جس کے دو کردار ایک ہی کہانی کو مل کر آگے بڑھاتے ہیں، واقعات محدود، کردار معلوم، کہانی سیدھی اور داؤ پیچ سے عاری، یہاں پر پیچ راہ گزاروں سے نہیں، کوئی بین السطور پیغام ہے نہ مطالب، سیدھی سادی اور دلچسپی کا رس لیے ہوئے، جو اپنے وحدت تاثر کو کہیں بھی کھونے میں کامیاب نہیں ہوتی، کہانی کار کی موجودگی بھی کہیں معلوم نہیں ہوتی کہ اس کہانی کار نے اپنی اس کہانی کو ایسے بہاؤ میں ڈال دیا ہے کہ کہانی اور قاری کے بیچ کو تیسرا وسیلہ اضافی اور فالتو ہی محسوس ہوتا اگر ہوتا تو۔ کہانی کا پلاٹ غیر ملکی ہے لیکن کردار پاکستانی ---۔ کہانی ایک یتیم لڑکے اور لڑکی کی ہے جو یتیم خانے میں پلتے بڑھتے ہیں اور یہ یتیم خانہ عیسائی مذہب کے پیروکاروں کا ہے، جہاں اسی مذہب کے ماننے والے اپنی مکمل آزادی کے ساتھ اپنے ادارے کو چلا رہے ہیں۔ اس کہانی سے ہمیں اس طرح اداروں کے مزاج اور وہاں کام کرنے والے کرداروں سے واقفیت ہوتی ہے، وہاں کا کلچر، ان لوگوں کے سوچنے کے انداز، ان کے مسائل، بچوں اور بچیوں کی طرز زندگی اور ان کے خوابوں کا پتا چلتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کہانی اور کہانی کار دونوں کا مقصد یہ معلومات فراہم کرنا ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ معلومات تو ان کرداروں کے تعارف اور ان کے نفسیات سے تعارف کے باب میں ہمیں ملتی جاتی ہیں۔ دونوں کردار اس یتیم خانے میں ملتے ہیں اور ایک روایتی محبت کی داستان کا گمان گزرتا ہے لیکن یہاں تو عشق اور زندگی کی مساوات مل جاتی ہے، جس میں سارہ اور میتھیو کے کردار اپنے اپنے نفسیاتی اور سماجی مسائل اور پھر جسمانی عارضوں کے ساتھ سامنے آتے جاتے ہیں، تعلیم کے حصول سے ملازمت کے حصول تک اور پھر محبت کے کامرانی تک یہ دونوں کردار حقیقی انسانی روپ میں ہمارے سامنے کھڑے نظر آتے ہیں اور پھر زندگی کے حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔ کہانی کار نے اس کہانی میں عشق کی کامرانی کا موضوع برتا ہے اور کہانی کو افسانوی رنگ میں ایک خوبصورت، متجسس، کلائمیکس پر چھوڑ کے قاری کو حیران کر دیا ہے، اس کہانی کا خاتمہ ایک ایسے موڑ پر ہوتا ہے جس موڈ (Mode) کو افسانوی موڈ کہنا چاہیے۔ یہ ایک ناولٹ کے بجائے ایک طویل افسانہ مانا جائے تو اس کی حیثیت کئی درجہ بڑھ جائے گی کہ اس میں تمام افسانوی اجزا ناولٹ کی نسبت بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اور، اس کی برت (Treatment) بھی خالصتاً افسانوی ہے۔ ''دی فادر، دی سن اینڈ دی ہولی گھوسٹ'' کی کہانی اس قدر نادر، جان دار، منفرد ہے کہ آپ اس کی صنف کا فیصلہ کہانی کے ختم ہونے تک کرنے کے دھیان میں ہی نہیں رہتے، ناولٹ ہے تو نہیں لیکن بالفرض مان بھی لیں کہ ہے تو ناولٹ ہو لیکن جب کہانی اپنے دو مرکزی کرداروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے تو پھر کوئی کردار ایسا نہیں آتا کہ جو آپ یا ان دو مرکزی کرداروں سے قاری کی توجہ ہٹا سکے، صالح وہ مسلمان لڑکا جو کالج میں سارہ اور میتھیو کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے آتا ہے لیکن وہ بھی ایک بودا اور کمزور کردار ہے، جو سارہ کو چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا میتھیو جیسے کمزور اور ناقابل اعتنا بندے کی موجودگی میں بھی وہ سارہ کو اپنے دل کی بات نہیں جتلا پایا، بلکہ وہ اس کو شادی کا انکار کر دیتا ہے۔ سٹیو اور ایلورا کی کہانی بھی صفحہ نمبر ۳۹ پر بنتی دکھائی دیتی ہے لیکن پھر وہ بھی ان کہی رہ جاتی ہے کیوں کہ تین ناموں والا لکھاری ایک افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہے، مجھے لگا یہ ایلورا کہ جو مصور ہے اور سٹیو

کہانی کو ایک مکمل محبت میں ڈھال دیں گے لیکن کہانی تو تھی ہی سارہ اور میتھیو کی۔غرض یہ کہانی قیصر نذیر خاور نے خوب لکھی ہے۔

اب ذرا اس کہانی کے ساتھ ایک معتدل ساذکر پاکستان کی سماجی اور معاشرتی حوالوں کا بھی ہے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے کہ جو بہت سے حوالوں سے زیر بحث ہے، یہاں اس بات کا اعادہ شاید میری بات کو زیادہ لحاظ کے قابل بنادے کہ اقلیتیں پاکستان میں خوش اور خوشحال ہیں اور یہ ان کے اپنے بیانات سے عام مسلمان کو پتا چلتا ہے، پاکستان کی اکثریت کا مسئلہ مذہبی تقسیم نہیں ہے، ہاں کچھ نہ کچھ ایسے حلقے ضرور ہیں کہ جو مذہب کی بناپر تعصب برتتے ہوں اور ایسا ہر ملک اور ہر سوسائٹی میں ہوتا ہے اور شدت کا عالم بھی اسی خطے کے میڈیا سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔احادیث اور قران کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر اور اقوال بھی موجود ہیں جو اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔اس کہانی میں یہ معاملہ کسی خاص پس منظر کے ساتھ نہیں آیا لیکن اقلیت کے مسائل اور اقلیت کی طرز فکر کے الگ ہونے سے آیا ہے۔اگر یہ بات صرف عیسائی اقلیت کے حوالے سے ہوتی تو شاید یہاں مذکور ہی نہ ہوتی لیکن اس کہانی میں ایک کردار قادیانی بھی مذکور ہے اور اس کے بارے میں اشارۃ ہی سہی، بات ہوئی ہے تو قادیانیوں کو پاکستان اسمبلی سے اقلیت قرار دیا ہے، وہ یہ مقدمہ ہارے ہیں اور عیسائی شروع ہی سے اقلیت ہیں لہذا ان دونوں کا آپس میں جوڑ نہیں بنتا تھا شاید یہ کہانی کار کا مقصود نہ ہو لیکن زیریں سطح پے ایک قسم کی ہم دردی کا اظہار ضرور محسوس ہوتا ہے، جو تخلیق کار کا حق ہے اور یہ بھی میں ماننے کے لیے تیار ہوں ''جو مچھیرے کا جال پانی کے اندر دیکھتا ہے، وہ مچھیرا دیکھے تو۔۔۔'' قیصر نذیر خاور کی اس کہانی میں بارہا ایسا گمان بھی گزرا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن وہ چھوڑ دیتا ہے، اس کا من چاہتا ہے کہ کچھ حقائق کہانی میں پرو دے لیکن اس کا مزاج یا اس کی اس کہانی کے تقاضے اس کے رہوار قلم کو روک لیتے ہیں۔البتہ کئی حوالے کہانی میں آ بھی گئے۔قیصر نذیر خاور نے بہت کچھ شاید اس خوف سے بھی چھوڑ دیا ہوگا:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری

اس کہانی میں کچھ معلومات بھی مجھے اضافی بلکہ غیر ضروری لگیں (شاید اس کی وجہ میرا مزاج یا میری بد ذوقی ہو، ان کو دہرانے احتراز کرتے ہوئے)۔وہ بات کہ جس سے کہانی پر براہ راست کوفرق نہیں پڑتا اس کا ذکر کہانی کی لذت کو خراب کرسکتا ہے گو اس کہانی کی لذت کو اس نے نقصان نہیں پہنچایا لیکن طبیعت مکدر ضرور ہوئی۔چونکہ کہانی اس قدر مضبوط اور جاذب ہے کہ قاری ان مقامات پر اٹکتا نہیں اور نکل جاتا ہے، سارہ اور میتھیو ایسے جاندار، خوبصورت، مکمل کردار ہیں کہ وہ اپنے قاری کی توجہ اور روانی کو بھٹکنے نہیں دیتے۔قیصر نذیر خاور کی اس کہانی میں بہت زمانے پہلے پڑھا ایک انگریزی ''Orphange'' بار بار یاد آیا گو اس کی کہانی اس کہانی سے بالکل جدا ہے لیکن یتیم خانے کا ماحول، مدر کیتھرین، فرینڈس، کیوبیکل روم، دیگر معاونین اور مددگاروں کا ذکر مجھے وہاں لے جاتا رہا۔یوں کہوں تو شاید میری بات زیادہ فصیح ہو کہ اس ناول کو پڑھتے وقت انگلش ناول کے انداز کا گماں گزرتا رہے، لگتا ایسا ہے کہ تین ناموں والے لکھاری کا انگلش ادب سے خاصا شغف ہے۔

مختصر، ناولٹ ''دی فادر، دی سن اینڈ دی ہولی گھوسٹ'' کو میں ایک طویل افسانے کے طور دیکھتا ہوں، جس کی کہانی ایک منفرد ہے، جس کہانی کے کردار میں جانے پہچانے ہیں، وہ جس ماحول میں اٹھ بیٹھ رہے ہیں میں اس سے نامانوس نہیں ہوں، باہمی چپقلشیں، شکر رنجیاں، گلہ مندیاں، زندگی کی کریہہ حقیقتیں، کامرانی پرمسرت اور ناکامی پر اشک باری، یک طرفہ محبت، قرب کی لذت اور نفسیاتی الجھاؤ، یتیمی کے پیدا کردہ خوف، مستقبل کی منصوبہ بندیاں، یہ سب کچھ ایسا ہے کہ کہانی کو مکمل پڑھے بنا چھوڑنے نہیں دیتا۔اقلیتی اعتبار نے بھی اس ادب پارے کی حیثیت مسلم ہے کہ پاکستان میں اس حوالے سے ادبی کام کی اشد ضرورت ہے اور پاکستانی قومیت کے مرکزی دھارے (Main stream) میں ایسے افکار اور خیالات کی ضرورت بھی ہے جو پاکستانی قومیت کے احساس کو محکم کریں اور آنے والے دنوں میں مذہبی ہم آہنگی اور قومی فکری یگانگت پیدا ہو کیوں ہم نے بہر حال پاکستان میں ہی پاکستانی بن کر رہنا ہے۔قیصر نذیر خاور کے ناولٹ کا اسلوب اردو فکشن کا مقبول اسلوب نگارش ہے جو ہمیں اردو فکشن میں ممتاز مفتی، اشفاق احمد، ابن انشا، احمد ندیم قاسمی کے ہاں دکھائی دیتا ہے، تین ناموں والے اس لکھاری کے پاس مضبوط لفظیات، خیال کی پختگی، بیان کی ندرت، زبان کی چاشنی اور شیرینی ہے، چار پانچ الفاظ ہندی کے بھی برتے ہیں جن کا لطف مستزاد ہے۔یہ ناولٹ اردو ادب میں اہل فکر و نظر سے داد و تحسین ضرور پائے گا اور وقت اس کی قدر کا تعین بھی کرے گا۔

اُردو غزل اٹھارویں اور انیسویں صدی میں

لبنیٰ صفدر/لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ) بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''ناسخ کی شاعری حساسیت سے محروم ہونے کے سبب ہماری حسوں کو متاثر کیے بغیر گزر جاتی ہے۔ ناسخ کی شاعری جذبہ و احساس کے معنوی عمل سے عاری ہے۔''(۵۱)

تاہم اس سب کے باوجود ناسخ نے اُردو غزل کی زبان کی تطہیر کے حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

خواجہ حیدر علی آتش (م ۱۸۴۷ء-پ ۱۷۷۸ء)

آتش کے بچپن اور جوانی کا زمانہ فیض آباد میں گزرا۔ ان کا شعری خمیر اسی خاک سے اُٹھ کر دبستانِ لکھنؤ کا ردِ عمل نظر آتی ہے۔ لکھنؤ کی عیش پرست اور جنسی ثقافت کے برعکس آتش نے شمالی ہند کی صوفیانہ روایت کا علم بلند کیا۔ حیدر علی آتش نے لفظی مرصع سازی کے ساتھ ساتھ خالص شاعری کو اپنی تجربہ گاہ بنایا۔

ہوائے دورِ مے خوش گوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

آتش کی شاعری کو ہم ایک نئی جہت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آتش اپنے خارجی اور باطنی رنگ میں مکمل شاعر ہے۔ آتش وصل اور نشاط کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں دردوغم اور ہجر و فراق کی کیفیات کم کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

آتش کے ہاں سرمستی، والہانہ پن اور جذب و مستی میں جنوں کی کیفیت کے مضامین کی وسعت صاف دکھائی دیتی ہے۔

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے بقول:

''آتش کی غزل کے آہنگ میں لفظوں کا ایک فطری بہاؤ ملتا ہے۔ اس آہنگ کی مثال ندی میں بہتے پانی کی سی ہے۔''(۵۲)

آتش کی شاعری لکھنوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اُس میں جو اثر اور درد ہے وہ اُن کی قناعت پسندی اور درویشی مزاج کی دین ہے۔ بقول آزاد:

''آتش سیدھی بات کو پیچ نہیں دیتے (۵۳)

وہ بادہ کش ہوں میری آواز پا کو سن کر
شیشوں نے سر حضور ساغر جھکا دیے ہیں
(آتش)

دیا شنکر نسیم (۱۸۴۵ء-۱۸۱۱ء) دیا شنکر نسیم لکھنؤ کے عہد زوال کے شاعر تھے۔ نسیم کی پیدائش، بچپن اور نوجوانی کے دور میں بتدریج اُردو غزل میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ آتش کی شاگردی اختیار کی۔ ان کا کارنامہ مثنوی گلزار نسیم ہے جو اپنے عہد کے ایک نئے شعری باطن کی شاعری ہے۔ یہ ایک ایسے نقطے کی دریافت ہے جہاں اس عہد کی اعلیٰ ترین شعری روایات مجتمع ہو گئی ہیں۔

شاہ نصیر (۱۸۳۹ء-۱۷۶۱ تقریباً) شاہ نصیر دلی کے شاعر تھے۔ نوجوانی میں شاعری کا آغاز کیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک شاہ نصیر شمالی ہند کے اہم شاعر بن چکے تھے۔ شاہ نصیر نے مجلسی شاعری میں زبان کو بہت اہمیت دی اور اسے کمال تک پہنچایا۔ زبان کی جس روایت کو انہوں نے فروغ دیا وہ ان کے بعد دلی میں مزید چمکی اور ان کے شاگرد ذوق نے استاد کی زبان والی روایت کو بلندی پر پہنچا دیا۔ آزاد شاہ نصیر کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

''نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے۔ مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے۔ تشبیہ اور استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے۔''(۵۴)

شاہ نصیر غزل کے بھرپور شاعر ہیں۔ شاہ نصیر کی شاعرانہ خصوصیات کو اٹھارویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں صدی کے ربع اول میں رکھ کر پرکھا جا سکتا ہے۔

جوش ہے موسم میں اس کا روز و شب اس کا خروش
ابر گریاں اور ہے یہ چشم پرنم اور ہے

....

کس کو ہوائے دشت نوردی ہے فصلِ گل
زنجیر پائے موج نسیم سحر مجھے

اُردو غزل میں شاہ نصیر کا نام اور کام رنگِ سخن کی مناسبت سے ہی محفوظ ہے اور رہے گا۔

ذوق (م ۱۸۵۴-پ ۱۷۸۹ء) انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی شاعری میں ہمیں آہ و فغاں اور گریہ زاری کے مضامین پس منظر میں جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذوق اپنے دور کی ادبی حرکت کے بہت بڑے نباض تھے۔ اس وجہ سے وہ اپنے زمانے کے مقبول شاعر بن گئے تھے۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''ذوق کو ''عوامی غزل گو'' کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی غزل انیسویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند کے لوگوں کے عوامی ذوق کی ترجمان بن گئی

تھی۔ اس غزل میں انیسویں صدی کے انسان کی زندگی کا تجربہ موجود ہے۔''(۵۵)

ذوق کے اشعار میں تجربے کا وہ عوامی عنصر موجود ہے جس کی وجہ سے اُن کے اشعار مشاعروں میں مقبول اور عوامی مجالس میں موقع محل کی مناسبت سے سنائے جاتے تھے۔

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

....

قسمت سے ہی لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

....

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

ذوق کو اپنے عہد میں بھرپور شہرت حاصل تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک اُن کی مقبولیت عروج پر نظر آتی ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے ربع اوّل گزرنے پر ذوق کی ادبی حیثیت کم ہوتی نظر آتی ہے۔ پھر بھی اُن کی غزل نے غزل کے ایوانوں میں تادیر اپنا اثر قائم رکھا جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

غالب (۱۸۶۹ء- ۱۷۹۷ء) انیسویں صدی کے ربع اوّل میں غالب کی شاعری کا نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اس عہد میں کوئی شاعر غالب کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ ۱۸۲۱ء کے قریب تک غالب کی غزل بے معنویت اور دقت طلبی سے دوچار دکھائی دیتی ہے۔ مگر نسخہ حمیدیہ (۱۸۲۱-۱۸۱۷ء) کی غزلوں سے معنویت اور ابلاغ کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں ادق پسند غالب کے ساتھ ساتھ قابلِ فہم غالب بھی رواں دواں تھا۔ غالب کے نفسی لاشعوری کا ابتدائیہ دیوانِ غالب کی پہلی غزل سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
(غالبؔ)

غالب کی شاعری میں غزل کے بیشتر معروف مضامین موجود ہیں۔ مگر ان کا انفرادی جوہر ہر جگہ اپنی شناخت کا اعلان کر دیتا ہے، بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''فرسودہ خیالات اور روایات سے دامن بچا کر چلنے اور تازہ ترمیلانات واقدار کو اپنا لینے کی اس روشِ خاص کا یہ اثر ہوا کہ ان کی سخن گوئی کا انداز بلحاظ مضامین واسلوب اپنے عہد کے مروجہ اندازِ غزل گوئی سے بہت الگ ہوگیا۔''(۵۶)

غالب کی شاعری میں ہم اس کے محبوب کا مکمل سراپا نہیں دیکھ سکتے۔ غالب حسن کے سراپا کا تمثال گر نہیں۔ بقول پروفیسر حمید احمد خاں:

''پیکرِ حسن کی وہ مکمل عکاسی جو روایتی سراپا سے مخصوص ہے غالبؔ کے ہاں کہیں نہیں ملتی۔ فارسی کلیات کے دس ہزار کے قریب اشعار کا خیال کیجیے تو اس بات پر اچنبھا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غالب فن اور کیفیاتِ حسن سے پیدا ہونے والے اندیشوں کا شاعر ہے۔''(۵۷)

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
(غالبؔ)

غالب کی شاعری جہاں زندگی کے پُرنشاط تصورات کو پیش کرتی ہے وہاں اس کی زندگی کے المیہ تصورات بھی موجود ہیں۔

خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
(غالبؔ)

غالب ایک نابغہ روزگار شاعر تھے۔ نابغہ کبھی بھی اوسط درجے کی سوچ کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''بڑے شاعر کا ہر معاملہ بڑا ہوتا ہے۔ عام غزل گو شاعر کی آنکھ سے آنسو بہتے ہیں۔ مگر غالب کے ہاں 'جوئے خوں' رواں ہوتی ہے۔''(۵۸)

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
(غالبؔ)

غالب کے ہاں بیک وقت زمانی اور لازمانی صورتِ حال ملتی ہے۔ غالب نے اپنے عہد کو وہ سب تو نہیں دیا جو وہ طلب کر رہا تھا ہاں اپنا انفرادی ادبی شعور ضرور دیا۔ غالبؔ کے ہاں خیال، فکر، تمثال گری، تہذیبی شعور، جمالیات اور طویل غزلیہ روایت کا کثیر سرمایہ موجود تھا۔ غالبؔ نے ان سب خوبیوں کا کمال فن سے برتا۔

ڈاکٹر عابد حسنین سیال کی شاعری پر ایک نظر

سیدہ حمیرا ارباب بخاری

شاعری کے افق پر ابھرتا ہوا روشن ستارہ، اردو اور سرائیکی کے میٹھے لہجے میں آزاد ہواؤں، حسین رنگوں، مہکتی خوشبوؤں، کھلتے گلابوں اور سچے جذبوں کے ترجمان ڈاکٹر عابد سیال۔ ہماری نئی نسل کے نمائندہ شاعر۔ جن کے سادہ الفاظ کی گہرائی سمندر جیسی، اک اک لفظ فکر و دانش میں ڈوبا ہوا۔ گویا سادگی و پرکاری کا امی شاہکار۔ ان کی شاعری کو پڑھنے والا اک لمحے کو کھو جاتا ہے۔ بحر کے سلسلے جیسے لہروں کی طرح رواں ہیں۔ بادلوں کی طرح خراماں ہیں۔ ایک ایسا شاعر جس کی شاعری کا ہر لفظ مستی عشق میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہجر کے گھور اندھیروں میں بھی امید وصل کا سورج روشن رہتا ہے۔ رجائیت سے بھرپور شاہکار جو ماضی کے بیت جانے کا افسوس تو کرتے ہیں، ماتم نہیں کرتے۔ بلکہ حال میں مست الست ہیں اور مستقبل کو نئی امید سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

بچپنا چھننے کا بھی تھوڑا سا عابد ہے ملال
حسن سے آنکھیں ملانے کو جوانی مل گئی

ان کی شاعری میں خود داری ہے۔ جو۔ محبت کرتے ہیں مگر سر اٹھا کر۔ محبوب کی محفل میں جانا بھی چاہتے ہیں مگر اپنی انا کی بقایت کے بھی متقاضی ہیں

آبرو میری گنوا دینا نہ اس کی بزم میں
ساتھ تجھ کو اے دل نادان لے کر میں چلا

ڈاکٹر صاحب کی شاعری جیسے قدیم وجدید خیالات کا مرصع ہے۔ ان کی شاعری میں گزرے زمانے کے شعراء کا عکس بھی ہے اور دور حاضر کے جدید لہجوں کی جھلک بھی ہے۔ میر کا درد، غالب کی جدت، آتش کی گرمی و رجائیت اور درد کا سا تصوف بھی پایا جاتا ہے۔ کبھی رنگ چرائے ہوئے ان کی شعلہ بیانی کی تپش اور دل افروز لہجہ کی کھنک قاری تک پہنچتی ہے۔

جدید نسل کو وقار کا درس دیتی ہے۔ اور دوشیزاؤں کے لیے اک ناصحانہ تنبیہ چھپی ہے۔ نوجواں لڑکیوں کو تہذیب و نسائیت کا درس دیتے ہیں

اب کہاں پہلی سی ان میں سادگی
آ گئی ہے خوب ان کو عاشقی
نت نیا فیشن ہے ان کی زندگی
عقل آ سکتی نہیں ان کو کبھی
اچھی لگتی ہیں انہیں رسوائیاں
کیسی ہیں یہ آج کل کی لڑکیاں

عابد ایک ایسا زود حس شاعر ہے جو دل کا درد دل میں چھپا کر رکھنے کا قائل نظر آتا ہے۔

قدم اٹھاتا نہیں ہوں اپنے کہیں نہ ظاہر ہوں میرے چھالے
جوان سے جاری ہے خون اب تک قدم اٹھائے تو رو پڑو گے

جارحیت و دا سوخت بھی نظر آتی ہے:

وفا کے عادی ہیں مدتوں سے کرو نا اتنے ستم تم مجھ پر
اگر کسی دن وفا کے عادی، جفا پہ آئے تو رو پڑو گے

عشق مجازی میں اس قدر مستغرق ہیں کہ دنیا کو محبوب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

کوئی منظر میں کیسے دیکھ سکتا ہوں
میری آنکھوں پہ تو تیری ہتھیلی ہے

ڈاکٹر صاحب کی زبان بیان سادہ و سلیس ہے اور گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے سادہ الفاظ کی گہرائی اور وسعت بکھراں جیسے سادگی میں پرکاری، جیسے گلوں کی آبیاری۔ چند لفظوں میں عرض مدعا بیان کرنے پر ملکہ حاصل ہے ان کو۔

زندگی بھر جنگ کے میدان میں رکھا مجھے
اس طرح سے عدل کے میزان میں رکھا مجھے
مجھ کو کھو دینے کا اس کو، اس قدر تو خوف تھا
اس لیے تو قیمتی سامان میں رکھا مجھے
ساری غزلیں ساری نظمیں اس نے لکھیں میرے نام۔
اس نے عابد اس طرح دیوان میں رکھا مجھے۔

عابد صاحب کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ایجاز و اختصار ہے۔ چند حرفوں کی مالا پرو کر عمر بھر کی کتھا بیان کر دینے پر قادر ہیں۔ دل کا درد خود ہی بیاں کر کے خود ہی رفوگری کرتے ہیں اور آپ اپنے چارہ گر بن جاتے ہیں۔ مست الست سے شاعر ہیں جو زندگی کی رنگینیوں کو کما حقہ کشید کرنا جانتے ہیں۔ اور بہت خوبصورتی سے معاشرے کے منافق چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔

کمال کا حوصلہ نظر آتا ہے کہ دشمن شناس بھی ہیں اور اس کی موجودگی کو سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

میری پشت پر وار جس نے کیا تھا
وہی شخص دیکھو میرے درمیاں ہے

صاف گوئی ان کی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف ہے۔

تیری زندگی میں کوئی اور ہے کیا؟
جی بالکل فلاں ہے، فلاں ہے، فلاں ہے

زندگی کی بے ثباتی سے نبرد آزما ہونے کا ظرف بھی رکھتے ہیں

تیری مشکلیں کٹ ہی جائیں گی عابد
ابھی جاری تیرا کڑا امتحاں ہے

عابد صاحب ذی شعور اور معاشرے کے بے حس رویوں پر گداز دل کے حامل شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی شرح کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اور اس کے لیے الفاظ کی طویل فہرست درکار ہے جو صفحہء قرطاس پر بکھر کر ان کی صلاحیتوں کے ہر لفظ کے موتی اور ہر حرف کے گہر کو ادب کے پوشیدہ سیپ سے باہر نکالے۔ ہمارے یہ گمنام شاعر مستقبل کا درخشاں ستارہ ثابت ہوں گے اور اہل ذوق کے معیار ادب پر پورے اتریں گے۔

ان کی پہلی کتاب زیر طبع ہے اور دوسری پر مشق سخن جاری ہے۔ بلاشبہ یہ میدان ادب میں سیک گراں مایہ اضافہ ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے اور یہ اپنے قلم کی طاقت سے معاشرے کے دہرے معیارات کی نقاب کشی کر سکیں۔ آمین

شاعر علی شاعر/کراچی (شاعر علی شاعر کے حال ہی میں شائع ہونے والے ''دیوان'' دانستہ سے انتخاب)

میں تجھ سے ہم کلام بہت دیر تک رہا
مجھ میں ترا قیام بہت دیر تک رہا
وہ دسترس میں تھا تو ہر اک چیز تھی مری
تب وقت بھی غلام بہت دیر تک رہا
محفل میں حُسنِ یار نظر آیا بار بار
جلووں کا اہتمام بہت دیر تک رہا
آنکھوں سے پی رہا تھا میں دیدار کی شراب
ہاتھوں میں میرے جام بہت دیر تک رہا
آنکھوں سے چومتے رہے اک دوسرے کو ہم
چاہت کا یہ نظام بہت دیر تک رہا
جس گھر کی چھت پہ چاند وہ آیا تھا دیکھنے
ضوبار اُس کا بام بہت دیر تک رہا
تعریف سُن کے میرے لبوں سے وہ چال کی
مستی میں خوش خرام بہت دیر تک رہا

بن کر رہِ حیات میں رہبر، لیے پھرا
مجھ کو جنونِ عشق کا در در لیے پھرا
لکھا تھا جو نصیب میں اُس کے حصول کو
دنیا جہاں میں مجھ کو مقدر لیے پھرا
دنیا کی تیز دھوپ میں سوچو تو دوستو
میں کس طرح یہ موم کا پیکر لیے پھرا
کس کو ہے شوق گردشِ ایام میں پھرے
مجھ کو مرے نصیب کا چکر لیے پھرا
اے دوست دشمنوں کے خیابان تک مجھے
تیری ادائے خاص کا منظر لیے پھرا
کوشش کے باوجود ترا گھر نہ مل سکا
نامہ کہاں کہاں یہ کبوتر لیے پھرا
اظہار اُس سے کر نہ سکا پیار کا کبھی
خواہش میں دل کی دل ہی کے اندر لیے پھرا
صحرا کی خاک چھانی کبھی دشت میں گیا
جذبہ وصالِ یار کا گھر گھر لیے پھرا
اک شخص کی جدائی میں شاعر تمام عمر
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لیے پھرا

روشن ہوا کی زد پہ جو قندیل کر گیا
وہ تیرگی کو نور میں تبدیل کر گیا
تخلیقِ کائنات کا جو نکتہ چیں بنا
مخلوقِ دو جہاں کی وہ تذلیل کر گیا
کھا کھا کے ٹھوکریں جو سنبھلتا رہا بشر
وہ آدمی حیات کی تکمیل کر گیا
جو دے سکا نہ اپنی وفا کا کوئی ثبوت
وہ پیش بے وفائی کی تاویل کر گیا
ایسے ملا گیا وہ رگِ جاں میں چاہتیں
پانی میں جیسے برف کو تحلیل کر گیا
تجھ کو ہے یاد کوئی ملا تھا تجھے کبھی
تیرے مزاج کی کوئی تکمیل کر گیا
لشکر وہ ہاتھیوں کا جو لایا تھا ابرہہ
برباد اُن کو جیشِ ابابیل کر گیا

کوشش کریں امروز تو کل ہوگا ہمارا
خود اپنا جواب آپ عمل ہوگا ہمارا
ہم راز تجھے اور بھی مل جائیں گے لیکن
اتنا تو بتا کوئی بدل ہوگا ہمارا
بتلاتے نہیں کیا تمھیں اشعار ہمارے
آئے گا جو اَب دورِ غزل، ہوگا ہمارا
تا عمر کریں گے تجھے پانے کی دُعائیں
کیوں دستِ دعا ساز یہ شل ہوگا ہمارا
اب گردشِ دوراں سے کبھی ہم نہ ڈریں گے
جو فیصلہ ہوگا وہ اٹل ہوگا ہمارا
جب آنکھیں ہوئیں چار تو وہ ناز سے بولے
اک روز کہیں تاج محل ہوگا ہمارا
اشعار میں شاعر کے نمودار ہے جو شخص
کہتے ہیں سبھی جانِ غزل ہوگا ہمارا

اجنبی شہر نے جی بھر کے تماشا دیکھا
کر دیا تو نے مرے غم میں اضافہ دیکھا
میں نہ کہتا تھا نہ کر خواہش دنیا ناداں
لٹ گیا کر کے زمانے کی تمنا، دیکھا
ہم کو دنیا نے محبت کی سزائیں دی ہیں
تجھ سا تنہا نہ مرے جیسا اکیلا دیکھا
ہم چلے رختِ سفر باندھ کے یوں ہی تو نہیں
ہم کو درپیش سفر تھا تو ستارہ دیکھا
روشنی تھی تری آمد سے مرے جیون میں
تیرے جانے سے ہوا دل میں اندھیرا دیکھا
جب گھری موجِ بلاخیز میں کشتی میری
میں نے طوفاں سے نہ گھبرا کے کنارہ دیکھا
مفلسی میں سبھی حالات بدل جاتے ہیں
جب پڑی دھوپ، بدن کا بھی نہ سایہ دیکھا
کس نے عرفاں کے اُجالے میں بہ طرزِ تنقید
قلب کی آنکھ سے دنیا کا سراپا دیکھا
ہم نہ کہتے تھے ہماری ہے زبانِ اُردو
ہم ہی نے گیسوئے اُردو کو سنوارا، دیکھا
موت کی سن کے خبر وہ بہت رویا شاعر
تیرے محبوب کا ہم نے بھی دِکھاوا دیکھا

تاثیرنقوی/لاہور

تاثیرنقوی نازک جذبوں اوراحساسات کے خوب صورت شاعر ہیں۔وہ میرے ہمدم دیرینہ ہیں۔اُن کی آمد سے اکثر میرے دفتر کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔ہم زندگی کے ہر موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔چائے کے دوران میں اُن کی غزلیں سنتا ہوں تو تاثیرنقوی کے اندر کی خوبصورتی مجھے اُن کے اشعار میں دکھائی دیتی ہے۔تاثیرنقوی کی شاعری کے بغیراس کا تعارف ادھورا ہے۔(مظہر سلیم مجوکہ)

ساحل پہ کھڑے لوگ تماشائی ہیں سارے
کوئی تو سفینے کو مرے پار اُتارے
قسمت میں مرے لکھ دے مدینے کی زیارت
در پر ترے بیٹھا ہوں میں دامن کو پسارے
محبوب مرا اس قدر انجان ہے یارو
اب تک نہیں سمجھا وہ محبت کے اشارے
اک رات چمکنے کی اجازت ہے انہیں بس
بجھ جاتے ہیں سورج کی تمازت سے ستارے
ہر شخص کو دھڑکا ہے یہاں جان کا اپنی
ایسے میں بھلا کوئی یہاں کس کو پکارے
ہم گردشِ حالات کے ہاتھوں ہیں پریشان
ہم جیسوں کو دن میں بھی نظر آتے ہیں تارے
رہ جاتا ہے ہر کوئی ترے حُسن کو تکتا
حیرت زدہ آتے ہیں نظر اب بھی نظارے
اس طرفہ تماشہ کہ سبھی رنگ ہیں پختہ
پھیلے ہوئے یہ رنگ کوئی کیسے اُتارے
تاثیر انہیں یاد بھی کرتا ہے زمانہ
بچھڑے ہیں یہاں لوگ جو تھے جان سے پیارے

آنکھوں نے مری دیکھے ہیں کیا خوب حسیں خواب
نیندوں سے دور ہو نہیں سکتے ہیں کہیں خواب
دیکھی جو کبھی رونق دنیا تو کھلا یہ
جس جا میں رکا ٹوٹ کے بکھرے ہیں وہیں خواب
امروز میں فردا کی کہانی بھی ہے شامل
بس اس لیے ہوتے ہیں میرے دل میں مکیں خواب
ان رت جگوں سے مجھ کو یہ اندازہ ہوا ہے
دکھلاتی ہے دانستہ کوئی ماہ جبیں خواب
اس بات سے انکار کوئی کر نہیں سکتا
جب یادیں حسیں ہوں تو پھر آتے ہیں حسیں خواب
افسانے کا قائل نہ میں پہلے تھا نہ اب ہوں
کچھ اور بھی پختہ کیے دیتے ہیں یقیں خواب
کیا باتیں ہوئی ہیں وہ، کہاں دن وہ گئے ہیں
اب دیکھنے پڑتے ہیں ہمیں زیر زمیں خواب
اب خاک کے بستر پہ بھی نیند آتی ہے مجھ کو
رہتے ہیں ہمیشہ ہی مرے دل کے قریں خواب
دنیا کی کسی چیز میں تاثیر نہیں ہے
کیا چھپ گئے ہیں جا کے کہیں عرشِ بریں خواب

بحرِ اُلفت کی نشانی تو ہے
میرے جذبوں کی کہانی تو ہے
ہے مرے دل میں گلستاں آباد
اس میں اک رات کی رانی تو ہے
دورِ ظلمت میں پکارا ہے تجھے
روشنی کی بھی نشانی تو ہے
یہ جو ہل چل سی مچی ہے دل میں
اس مرے درد کا بانی تو ہے
چار سو پھیلتی جاتی ہے جو
خوشبوئے گُل وہ سہانی تو ہے
تجھ کو دیکھو تو زباں ملتی ہے
میرے لہجے کی روانی تو ہے
ہم تو تاثیر ترے دم سے ہیں
میرا احساس و معانی تو ہے

ہیں مجھے جھیل سی لگیں آنکھیں
حال مجھ سے مرا کہیں آنکھیں
اُس کی خوشبو سمٹنے لگتی ہے
مجھ سے جب گفتگو کریں آنکھیں
یہ مری روح کی امانت ہیں
دکھ جہاں بھر کے کیوں سہیں آنکھیں
ایک دوجے سے کیسے ملنا ہے
مجھ سے چُھپ چُھپ کے یہ کہیں آنکھیں
دل کی حالت عجیب ہوتی ہے
آگ کی طرح جب جلیں آنکھیں
حالِ دل کی اُنھیں خبر ہو جائے
وہ اگر غور سے پڑھیں آنکھیں
کاش یہ معجزہ بھی ہو جائے
میری جانب تری بڑھیں آنکھیں
تاک میں ہوں میں ایسے منظر کی
جُھک کے اک بار وہ اُٹھیں آنکھیں
روح تک روشنی اُتر جائے
گر سہارا مرا بنیں آنکھیں
میرا دل باغ باغ ہو جائے
میرے رستے میں جب بچھیں آنکھیں
رونے لگتا ہے میرا دل تاثیر
میری حالت پہ جب ہنسیں آنکھیں

نواب ناظم/لاہور

ابھی دن ہی تو نکلا تھا ستمگر رات آ پہنچی
کھلی ہی تھیں ابھی آنکھیں کہ سر پر رات آ پہنچی
رُخِ مہتاب کیا اوجھل ہوا پلکیں جھپکتے ہی
مری صبحِ مقدر کے برابر رات آ پہنچی
ابھی لکھنے ہی والا تھا سفر نامہ محبت کا
بیاضِ وقت کے سادہ ورق پر رات آ پہنچی
اندھیرے میں مجھے کچھ روشنی ملنے کا امکاں تھا
مگر جگنو تمنا کے نگل کر رات آ پہنچی
کہاں تک ساتھ دیتے چاند اور سورج کے درباری
اسی باعث نگر میں لے کے پتھر رات آ پہنچی
بڑی مشکل سے میں نے عزم کا سورج اُچھالا تھا
مقدر میں اندھیرا تھا کہ سر پر رات آ پہنچی

مرے آنسو مرے سجدے یہ سر کب راس آیا تھا
محبت میں دعاؤں کا اثر کب راس آیا تھا
سراپا دھوپ نے میرا جلا ڈالا تو کیا شکوہ
مجھے اس گھر کے آنگن میں شجر کب راس آیا تھا
مری پہلی محبت کے ابھی تک زخم تازہ ہیں
مجھے پہلی محبت کا سفر کب راس آیا تھا
عطا کرتا رہا میں پتھروں کو زندگی لیکن
مسیحائی کا مجھ کو یہ ہنر کب راس آیا تھا

جاگ رہا ہے درد پرانا رفتہ رفتہ
ہونے لگا ہے دشت سہانا رفتہ رفتہ
اتنی خوشی برداشت نہ ہو پائے گی مجھ سے
تم میری دنیا میں آنا رفتہ رفتہ
دنیا بہہ جائے گی ان کی طغیانی میں
اے آنکھو تم نیر بہانا رفتہ رفتہ
کیا جانے کب چاند فلک کا گہنا جائے
دھرتی کو ہے چاند بنانا رفتہ رفتہ
رفتہ رفتہ چھوڑ گئے ماں باپ کو بچے
ٹکڑے ٹکڑے ہوا گھرانا رفتہ رفتہ
وقت سے پہلے ترکش خالی ہو جائے گا
تم دشمن پر تیر چلانا رفتہ رفتہ
دیمک نے اندر سے چاٹ لیا ہے اس کو
تم نواب کو ہاتھ لگانا رفتہ رفتہ
ٹوٹ گئے ہیں ناظم سارے ضبط کے بندھن
بکھرا ہے یہ تانا بانا رفتہ رفتہ

اُڑتے جاتے ہیں پرندے وادیٔ اشجار سے
کیا کوئی طوفاں اُٹھے گا دامنِ کہسار سے
کس طرح لکھے نشاطِ زندگی کی داستاں
مفلسی لپٹی ہوئی ہے خامۂ فنکار سے
کوئی شہرِ ماہ و انجم سے بھی آگے جا چکا
ہم ابھی تک کھیلتے ہیں ہیر کے کردار سے
ہم نے بچوں کے کھلونوں کی طرح ناظم یہاں
خود ہی لاکھوں غم خریدے وقت کے بازار سے

آندھیوں کا کیسا ڈر تھا شہر میں
اک بگولے کا سفر تھا شہر میں
اک پرندہ اپنے غم کی اوٹ میں
بے نوا بے بال و پر تھا شہر میں
تجھ کو پانے کی لگن میں رات دن
اک مسافر دربدر تھا شہر میں
ذات کی تفریق کیا تھی ہر طرف
خودنمائی کا بھی شر تھا شہر میں
تو بھی جا کر گاؤں میں رہنے لگا
تو ہی تو اک چارہ گر تھا شہر میں
وہ خبر لیتا کسی کی کس طرح
خود ہی ناظم بے خبر تھا شہر میں

صحرا کو گلزار بنانے نکلا تھا
چاہت کے میں پھول کھلانے نکلا تھا
اپنے جسم کے گنبد کے در توڑ کے میں
سناٹوں کا نوحہ لگانے نکلا تھا
ماضی کی ہر بات بھلا دی تھی میں نے
دشمن کو بھی دوست بنانے نکلا تھا
سورج بھی دیوار بنا تھا رستے کی
سوچوں کے جب دیپ جلانے نکلا تھا
لہروں نے بھی ساتھ دیا تھا دریا کا
پانی پر تصویر بنانے نکلا تھا
اس کے چاہنے والے شہر میں اور بھی تھے
جس کو اپنا حال سنانے نکلا تھا
جگنو، تارے چاند بھی مجھ سے نالاں تھے
دھرتی کی جب مانگ سجانے نکلا تھا
ناظم کتنے ساون آنکھ میں روکے تھے
جب میں دل کی پیاس بجھانے نکلا تھا

زخم ہائے درد کی تصویر ہے
میرا دل اب وادیٔ کشمیر ہے
میں خلاؤں کا مسافر ہوں مگر
پاؤں میں تو جبر کی زنجیر ہے
میرے گھر کے صحن میں سوکھا شجر
تشنگی کے کرب کی تفسیر ہے

شاذیہ رباب

ہر چھت سے جھڑتی خاموشی
دیوار سے رِستی خاموشی
اس گھر میں تنہا رہتی ہے
اک ماں اور اس کی خاموشی
میں خود سے باتیں کرتی ہوں
اور مجھ پر ہنستی خاموشی
کل بند الماری میں دیکھی
کاغذ میں لپٹی خاموشی
کچھ یادوں کا اک تکیہ ہے
اور نیند کو ڈستی خاموشی
ہے تنگ اس شور شرابے سے
مرے اندر بڑھتی خاموشی
جب چاہت کو مرقوم کیا
اوراق پہ رکھی خاموشی
دنیا والوں نے دیکھی ہے
شعروں میں ڈھلتی خاموشی
تاریک شبوں کی ساتھی ہے
مرے ساتھ ہی جلتی خاموشی
برسوں سے بند کواڑوں کے
تالے پر بیٹھی خاموشی
کل اس کا خط موصول ہوا
کھولا تو پھیلی خاموشی

یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر سے پکارے جائیں
خواہشِ زیست کی پاداش میں مارے جائیں
کتنے جنموں کا تسلسل ہے کہانی میری
اس میں اب کچھ نئے کردار اتارے جائیں
کتنی صدیوں سے یہاں صرف خدا آئے ہیں
اب تو انساں مری دھرتی پہ اتارے جائیں
تہمتیں ساری محبت کی یہیں چھوڑ کے جا
کیوں ترے ساتھ سفر میں یہ خسارے جائیں
وقت کی گرد میں دھندلا گئے جو برسوں سے
کبھی فرصت میں وہ چہرے بھی نکھارے جائیں
اے خدا تنگ ہوئی تیری زمیں لوگوں پر
اب بتا خود ہی کہاں درد کے مارے جائیں
مل نہ پائیں گے کبھی ساتھ چلیں گے دونوں
جس طرح سے کسی دریا کے کنارے جائیں

سنو تم جانتے ہو کیا؟

کہ یہ ریشم کا کیڑا بھی
جو ریشم خود بناتا ہے
مگر ریشم کی حدت سے
وہ اک دن مر ہی جاتا ہے
میری جاں یہ حقیقت ہے
محبت ریشمی بھی ہو
محبت دائمی بھی ہو
جدائی بھی ضروری ہے
وگرنہ اتنی قربت سے
یہ سانسیں رکنے لگتی ہیں
محبت کی ردا میں بھی
یہ دم گھٹنے سا لگتا ہے
تو ہمدم ایسا کرتے ہیں
محبت کی لطافت کو
بچانے کے لئے ہم تم
ذرا سا ہجر سہتے ہیں

سمے کی زنجیر

میرے قدموں میں پڑ گئی تھی
مجھے نہ بڑھنے سے روک پائی
میری تو رفتار تیز تر تھی
کہ وقت کو اپنے ہاتھ سے ہی
میں نوچ کر پھینک آئی کب سے
جو لوگ میرے قبیل کے تھے
میں ان سے آگے نکل چکی تھی
یہ میرا ادراک، میری وحشت
میرا جنوں اور خواب میرے
زمانے بھر سے جو منفرد تھے
انہیں کو ہمراہ اپنے لے کر
بہت سے لوگوں کو پیچھے چھوڑے
میں چل رہی تھی
مگر یہ کیا ہو گیا اچانک
یہ وقت کیسے پلٹ گیا ہے
میں مضمحل اور تھکن زدہ سی
اک حیرتوں کا جہاں سجائے
بغیر کوئی قدم بڑھائے ہی رک گئی ہوں
کہ پھر کسی وقت کی یہ زنجیر
میرے پیروں میں آ پڑی ہے

قندیل بدر/

ساسانائے

تم مجھ سے کئی صدیوں کی دوری پر پیدا کی گئی ہو
ہم میں حائل یہ طویل زمانی فاصلے مجھے کاٹتے رہتے ہیں
اور مسلسل پاٹتے رہنے سے بھی کم نہیں ہوتے
میں اپنے شاندار گھوڑے پر تمہاری طرف دوڑتا رہتا ہوں لیکن تم دوسری جانب تیز رفتار سواریوں میں اڑتی رہتی ہو اور مجھ سے دور، بہت دور ہوتی جاتی ہو
ساسانائے!
تم میرا ہی کوئی قیمتی حصہ ہو جو اپنی بہترین شکل پا کر مجھ سے بہت اونچائی پر رکھ دیا گیا ہے
میں تمہیں چاند میں دیکھتا رہتا ہوں اور اپنے پہلو میں محسوس کرتا ہوں
میں نے تم تک پہنچنے میں کئی چابک کوڑے کھائے ہیں
میری پیٹھ زخموں سے سنی ہوئی ہے جس کے داغ کبھی نہیں دھلیں گے
میں جیل کی کال کوٹھڑی میں بھاری زنجیروں میں جکڑا
زخمی نڈھال تمہاری خوشبو میں بھیگتا رہا ہوں
تمہیں چھونے کی خواہش میں کتنے سمندر تیر چکا ہوں
لیکن تم خدا کی لاڈلی ہو جو مجھے دیکھ کر طنزیہ مسکراتی رہتی ہو
تم تک پہنچنے کے رستے میں کئی سانپوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جن کے زہر نے میرے پاؤں گلا دیے ہیں
اب میں کبھی بھاگ نہیں سکوں گا لیکن سینے کے بل تمہاری طرف رینگتا رہوں گا
ساسانائے!
میں لالی بروک کا سرخ شہزادہ تمہارے ہجر میں گھل کر سیاہ پڑ چکا ہوں
تم میرے لہو میں لہو، ماس میں ماس، ہڈیوں میں ہڈیوں کی طرح ہو
تم میرے وقار کا تاج ہو میں تمہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دیکھتا ہوں اور تمہاری بلند قامتی کو سجدے کرتا رہتا ہوں
ساسانائے!
تم تک پہنچنے کے لیے مجھے کسی لعل ہیرے کی ضرورت نہیں ہے
میں سانس لیتا ہوں تو تم میری پسلی سے نمودار ہو جاتی ہو
تمہارے ہونٹوں کی وہسکی میرے سارے زخموں کا مرہم ہے لیکن یہ سکاٹ لینڈ میں اب دستیاب نہیں
تم مجھے از بر ہو چکی ہو
میں تمہیں کسی بھی پل مکمل جی لیتا ہوں پی لیتا ہوں لیکن حلق چیرتی یہ پیاس کبھی نہیں بجھتی
ساسانائے!
تمہارا جادوئی لمس مجھے ہر بار موت کی تاریک گھاٹیوں سے کھینچ لاتا
میں جانتا ہوں تم مجھے مرنے نہیں دو گی اور میں تمہیں ہمیشہ زندہ اور جوان رکھوں گا
مجھے خوشی ہے کہ تمہارے عشق کے لیے مجھ جیسے جنگجو کا انتخاب کیا گیا ہے
میں ہر جنگ ہار جاؤں گا، پسپا کر دیا جاؤں گا لیکن تمہارا عشق جیت لوں گا
ہم اس زمانے کا انتظار کریں گے ساسانائے
جب وقت کی طنابیں کھل جائیں گی
ہم ہر قید و بند سے آزاد ہو جائیں گے اور پرسکون سرگوشیوں میں ایک لمبی سانس کھینچ سکیں گے، خدائی اوڑھ سکیں گے
ایک مساوی ہو سکیں گے

پیشین گوئی

زمین کانپنے لگی ہے
آسمان لرزنے لگا ہے
دیواروں میں دراڑیں پڑ چکی ہیں
ہوائیں در پیٹتے ہوئے پیغام دے گئی ہیں
چھت سب سے پہلے گرے گی
سورج مغرب سے نکلنے کی تیاری میں ہے
کل تمہیں سبزہ سرخ دکھائی دے گا
گھر نئی بہار میں سوکھے پتوں کی طرح چھناکے سے ڈھ جائیں گے
بلکتے بچوں کے آنسو دل چیر دیں گے
ملبے کی ڈھیر پر بیٹھی بے سہارا عورتیں تمہاری مردانگی کا بھرم توڑ دیں گی
کچھ نہیں بچے گا
ماسوائے دور دراز کسی سفید محل میں گونجتے اس قہقہے کے
جو تمہاری سسکیوں کا بھرپور جواب ہوگا

بھور کی تجیلی دھوپ
رس بھری رسیلی دھوپ
اوڑھ لی ہے دھانی شام
پہن لی ہے پیلی دھوپ
ملگجی ہتھیلی پر
ٹانکا ٹانکا سی لی دھوپ
آنکھ کے دریچے سے
جھانکتی ہے نیلی دھوپ
سانس سانس جھیلی ہے
رت جگے کی گیلی دھوپ
پربتوں سے اگتا چاند
ساحلوں کی سیلی دھوپ

فائیو اسٹار ہوٹل کے ''فضائل''

عطاء الحق قاسمی

میں نے ایک بار لکھا تھا کہ سفید پوش وہ ہے جو ماسی برکتے کے تنور سے کھانا کھا کر نکلے اور ہوٹل ہلٹن کے باہر کھڑے ہو کر خلال کرتا پایا جائے۔ مگر کچھ سفید پوش ایسے بھی ہیں جن کا ''مفتا'' اگر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں لگ جائے تو وہ وہاں سے کھانا کھا کر نکلتے ہیں اور عادتاً ماسی برکتے کے تنور کے سامنے کھڑے ہو کر خلال کرنے لگتے ہیں۔ خود میرا اشمار بھی انہی سفید پوشوں میں ہوتا ہے مگر مجھ میں اور دوسرے سفید پوشوں میں فرق یہ ہے کہ مختلف مشاعروں اور کانفرنسوں وغیرہ کے دوران مجھے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا ہے لیکن کھانا وغیرہ کھانے کے بعد میں عادتاً نہیں احتیاطاً کسی بابو ہوٹل میں جا کر چائے پیتا ہوں۔ احتیاطاً اس لیے کہ کانفرنس کے منتظمین بسا اوقات صرف کمرے کا کرایہ اور کھانے کا بل ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ مہمان ان ہوٹلوں میں چائے پیتے ہیں وہ اکثر اپنے ''رسک'' پر پیتے ہیں بلکہ جن کانفرنسوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے منتظمین کی طرف سے جو ''ہدایت نامہ'' جاری کیا جاتا ہے اس میں ایک ہدایت یہ بھی ہوتی ہے کہ لانڈری اور استری وغیرہ کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ چنانچہ جو سمجھ دار مہمان ہیں وہ ہوٹل میں ''استری'' اپنے ساتھ لاتے ہیں۔

جس طرح ہر کام کے پس پردہ کوئی وجہ ہوتی ہے، اسی طرح یہ کالم لکھنے کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ میں ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کا بہت زخم خوردہ ہوں اور وہ یوں کہ کبھی کبھار اگر ''مفتا'' نہ لگے تو وضع داری قائم رکھنے کے لیے اس ''قماش'' کے ہوٹلوں میں اپنے خرچ پر بھی ٹھہرنا پڑ جاتا ہے۔ بصورت دیگر احباب پر سفید پوشی کا بھرم کھل جاتا ہے۔ گزشتہ دنوں میں نے ایک اسی قسم کے ہوٹل میں قیام کے دوران ناشتہ منگوایا اور ناشتے کے بعد بل کا مطالعہ شروع کیا تو اس میں انڈے کے چار سو روپے لگائے گئے تھے، میں نے ویٹر سے پوچھا کہ بھائی اس انڈے کے سلسلے میں منیجر صاحب کو خود بھی کوئی زحمت اٹھانا پڑتی ہے اتنے پیسے چارج کئے ہیں، مگر وہ بیچارا جواب میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اسی طرح ایک دفعہ غلطی سے میں نے شلوار کرتہ دھونے کے لیے دے دیا، شام کو دیا صبح دس بجے چاہیے تھا لانڈری بوائے نے کہا جناب ارجنٹ پر ڈھلے گا، میں نے بے نیازی سے کہا پھر کیا ہوا؟ مگر پھر ہوا یہ کہ اس شلوار کرتے کی دھلائی کے مجھے اتنے ہی روپے ادا کرنا پڑے جتنے میں یہ سوٹ میں نے سیل سے خریدا تھا۔

ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کے خلاف میرے غصے کی ایک وجہ بلکہ بنیادی وجہ جو میں نے ابھی تک نہیں بتائی تھی یہ ہے کہ میرے ایسے سفید پوشوں کی انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے ان میں سے ہر ہوٹل نے بجلی کی وائرنگ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور میوزک سسٹم فلش سسٹم اور اس طرح کے جتنے بھی دوسرے سسٹم ہیں دوسرے ہوٹلوں سے مختلف رکھے ہوئے ہیں اور ان میں کچھ اتنی راز داری پائی جاتی ہے کہ اگر تلاش بسیار کے بعد ٹیبل لیمپ جلانے کا سوئچ مل گیا ہے تو باقی روم کی لائٹ آن کرنے کے سسٹم کا سراغ نہیں مل رہا۔ اسی طرح اگر میوزک آن کرنے کی ''ٹیکنالوجی'' تک رسائی ہو گئی ہے تو فلش سسٹم کا پتہ نہیں چل رہا۔ غرضیکہ ہر فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک نہ ایک ''گھنڈی'' ایسی رکھ دی جاتی ہے کہ ہر دفعہ جھجکتے جھجکتے ہوٹل کے ملازم کو بلانا پڑتا ہے اور اسے اعتماد میں لے کر پوچھنا پڑتا ہے کہ بھائی بتی کس طرح جلائی جاتی ہے اور فلش کس طرح چلایا جاتا ہے اور اس کے جواب میں وہ موذی آپ کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ ''پتہ نئیں کتھوں آ جاندے نیں!''۔ بس یہی ان ہوٹلوں کا ''بزنس سیکرٹ'' بھی ہے کہ گاہک کو احساس کمتری میں مبتلا کر دو اور اس کی آنکھیں اتنی چکا چوند کر دو کہ وہ ہر دفعہ:

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

والا شعر پڑھتے ہوئے ہوٹل سے رخصت ہو اور اس طرح رخصت ہو جس طرح سکندر دنیا سے رخصت ہوا تھا!

تاہم واضح رہے کہ میں نے ابھی تک ان ہوٹلوں کا صرف تاریک رخ دکھایا ہے، روشن رخ تو دکھایا ہی نہیں اور ان ہوٹلوں کا ''رخ روشن'' تو ایسا ہے کہ پروانوں کو سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ شمع کی طرف جائیں یا اس رخ روشن کا طواف کریں مثلاً ایک مثبت پہلو ان ہوٹلوں کا یہ ہے کہ جو کاروباری سودے کروڑوں میں طے ہونے ہوتے ہیں وہ انہی ہوٹلوں میں طے ہو سکتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں اٹھنے، بیٹھنے اور لیٹنے والا شخص اس قدر معزز سمجھا جاتا ہے کہ اس کا کالا دھن بھی سفید ہو جاتا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں تو خون سفید ہونے لگتا ہے۔ دوسروں کو چھوڑیں انسان اپنے طور پر خود کو اتنا معزز سمجھنے لگتا ہے کہ اسے دوسرا کوئی شخص معزز ہی نہیں لگتا اور یوں ان ہوٹلوں کے ذریعے معاشرے میں عزت کا جو ''خود تشخیصی نظام'' نافذ ہوا ہے اس کے نتیجے میں ساری قدروں پر از سر نو نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے تاہم ان معاشی اور معاشرتی حوالوں کے علاوہ ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کی ایک قومی خدمت بھی ہے جسے کم از کم ہم پاکستانی فراموش نہیں کر سکتے، سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر ہمارے زعماء نے ڈھاکہ کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہی میں پناہ لی تھی۔

دوستی اور غبارے

حسین احمد شیرازی

کسی سیانے نے کہا ہے کہ خدا ہمیں صرف رشتہ دار دیتا ہے، خدا کا شکر ہے ہم اپنے دوست خود منتخب کر سکتے ہیں۔ پھر دوستی کا تعلق زیادہ گہرا ہو جائے تو لوگ بھائی بن جاتے ہیں جبکہ بہت اچھے بھائی ایک دوسرے کو دوست سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسان وہ واحد جانور ہے جو اپنے دشمن سے اس وقت تک دوستانہ تعلقات استوار رکھ سکتا ہے جب تک وہ اسے مکمل طور پر تباہ نہ کر دے۔ ویسے یہ دوستی بھی عجیب پہیلی ہے۔ ازل سے انسان اس کی ماہیت کو جاننے کی کوشش کر رہا ہے اور اس تگ و دو کا بنیادی نقطہ ابھی تک تو یہی سمجھ میں آیا ہے کہ یہ کوئی غیر مرئی چیز ہے جیسے مقناطیسی لہریں یا نور جس کا ہالہ انسان کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے کہ اسے اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ دوستی یا محبت ایک سمندری طوفان ہے جس کے سامنے ایک انسان کیا، یہ کائنات بھی ایک کاغذ کی کشتی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی بشرطیکہ یہ ہماری اردو یا پنجابی فلموں والا پریم نہ ہو۔

مثالی شناسائی کی پہچان یہ ہے کہ اگر آپ کا دوست سو سال جینا چاہتا ہو تو آپ دعا کریں کہ آپ کی عمر سو سال سے ایک دن ضرور کم ہو کیونکہ آپ اس کے بغیر جینا نہیں چاہتے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ ساتھ جینے مرنے کی باتیں کتابی قصے ہیں۔ عاشق اور محبوبہ نے جب اس دنیا میں اکٹھے رہنا ناممکن پایا تو وہ ایک بہت اونچی عمارت کی چھت پر جا پہنچے جہاں سے کود کر انھوں نے خودکشی کر لینی تھی۔ مقررہ گنتی پر مرد نے تو چھت سے چھلانگ لگا دی لیکن خاتون نے ارادہ تبدیل کر لیا۔ وہ بڑے دکھی دل سے اس شخص کو موت کی طرف اکیلا بڑھتا دیکھ کر پشیمانی کے سمندر میں غرق تھی مگر اس کی ندامت جلد ختم ہو گئی جب اس نے دیکھا کہ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اس شخص نے خفیہ پیراشوٹ کھول لیا اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا نیچے زمین پر اُتر گیا!!

اک خط جو کبھی میں نے بیرنگ انھیں بھیجا
بیرنگ ہی آیا ہے اس خط کا جواب آخر

انسان کو سماجی جانور بھی کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غم بانٹنے سے آدھے رہ جاتے ہیں جبکہ خوشیاں بانٹنے سے دُگنی ہو جاتی ہیں۔ ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلق کی اہم بنیاد تو اس غم اور خوشی کو گھٹانے بڑھانے ہی میں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اگر آپ سوچتے ہیں کہ آپ دوسروں کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو آپ کم عقل ہیں لیکن اگر آپ کا خیال ہے کہ دوسرے لوگ آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو پھر آپ خارج از عقل کے مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں!

دوستی یا عشق حواسِ خمسہ کی جانچ پڑتال سے ماورا ہوتے ہیں۔ لیلیٰ کے حسن کا انحصار مجنوں کی آنکھ پر ہے کہ لیلیٰ تو کالی تھی۔ برطانوی شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم نے ایک طلاق یافتہ مسز سمپسن کے لیے بیسویں صدی میں وہ سلطنت قربان کر دی تھی جس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں بھی برطانوی تخت کا وارث شہزادہ چارلس، ڈیانا جیسی خوبصورت حسینہ کو چھوڑ کر کومیلا پارکر جیسی عام سی خاتون کی زلفوں کا اسیر ہو گیا تھا:

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

ہمارا دوست شوکت بٹ کبھی کبھی عقل مندی کی باتیں بھی کرتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا کہ آج کل بہت سے لوگوں کی دوستی برائلر مرغی کی مانند ہے۔ جس میں صرف حجم ہے یا یہ ایسا غبارہ ہے جسے دوست کی ضرورت کے سوال کی ذرا سی بھی پن چبھ جائے تو یہ پھٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔

ہم بولے کہ کس کتاب کے اقتباسات پڑھ رہے ہو تو وہ ذاتی قصے سنانے لگا۔ شوکت نے اپنے ایک رفیق کو مشترکہ کاروبار کی تجویز دی تو اس نے جواب دیا کہ تم میرے اتنے اچھے دوست ہو، میں تمھیں کھونا نہیں چاہتا۔ شوکت نے استفسار کیا کہ جو گاؤں ابھی بسا نہیں، اس کو لوٹا کیسے جاسکتا ہے تو دوست نے بے تکلفی سے تشریح کر دی کہ اسے بے ایمانی کی عادت ہے اور وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ پھر جس دن شوکت کو بے ایمانی کا پتہ چلے گا تو دوستی وفات پا جائے گی! کسی نے اسے کہا تھا کہ تم نے کسی کا کیا دوست ہونا ہے، تم تو اپنے بھی دوست نہیں ہو بلکہ خود اپنے سب سے بڑے دشمن ہو!!! تو اس نے جواب دیا: ”کامیابی کے لیے چھوٹی موٹی قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے:

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

اب ایسے بے حیا انسان کو سمجھانا اُڑتے ہوئے کبوتر کے پیٹ میں زندہ ہاتھی ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔

شوکت مالی مشکلات کا شکار ہوا تو اپنے دوست

نجم سے ملا اور اس سے مشورہ مانگا کہ وہ مالی امداد کے لیے رفیق سے رابطہ کرے یا شریف سے۔ شوکت کا خیال تھا کہ نجم یہ سن کر کہے گا کہ تم میرے سکول کے ہم جماعت ہو، کسی سے مت مانگو اور مجھ سے لے لو۔ نجم نے دونوں دوستوں کے حدود اربعہ پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد کہا کہ تم ابھی شریف کے پاس چلے جاؤ کہیں وہ دفتر سے نکل نہ جائے! اس واقعہ کے بعد نجم نے اس کا فون سننا بھی بند کر دیا۔ شوکت نے ایک مشترکہ دوست سے گلہ کیا تو نجم نے اس دوست کو وضاحت کی کہ وہ تو ایسا اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے کرتا ہے۔ اس انوکھے فلسفے کی تشریح پوچھی گئی تو وہ بولا ''یار دیکھو میں اگر شوکت سے ملوں تو وہ مجھ سے پیسے مانگے گا۔ تمھیں پتہ ہے میں اس معاملے میں ذرا احتیاط پسند ہوں اور قرض کو محبت کی قینچی سمجھتا ہوں۔ اس طرح میرے رویے سے اس کا دل آزردہ ہوگا جو میرے ایمان کے مطابق کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے! اور ویسے بھی اگر کوئی شخص مصیبت میں ہے تو اس کی مدد کرنا مشیتِ ایزدی میں مداخلت کے مترادف ہے جو صریحاً کفر ہے۔'' نجم کا یہ بھی خیال ہے کہ دوستی اور غرض مندی تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور آشنائی جیسے مقدس تعلق کو ضرورتوں اور حاجتوں جیسی آلائشوں سے پاک رکھنا چاہیے۔ اس پر کسی نے فقرہ کسا کہ اگر کسی ہمدم نے مشکل گھڑی میں کام نہیں آنا تو پھر دوستی کیا اچار ڈالنے کے لیے کرنی چاہیے۔ ایک اور تبصرہ ہوا کہ کسی طوائف نے پستول کا لائسنس بنوالیا۔ وجہ پوچھی گئی تو بولی کہ عزت کی حفاظت کے لیے بنوایا ہے! سچ تو یہ ہے کہ نجم کا فلسفہ اور طوائف کی عزت دونوں ہی سیوریج پائپ لائن کی طرح ہیں، جہاں سے بھی ڈھکن اُٹھائیں تعفن ہی تعفن ہے۔

ان دنوں شوکت کے پسندیدہ اشعار تھے:

دوستوں سے مجھے شکایت ہے
آخرش کوئی واردات بھی تھی
وقت سے پیشتر ہی بھاگ گئے
وقت پر بھاگتے تو بات بھی تھی

پرانا قصہ ہے۔ ایک افسر مشرقی پاکستان سے تبدیل ہو کر اسلام آباد آئے تو ان کے ایک دوست نے انھیں اپنے سرکاری گھر میں پناہ دی۔ یہ مکان کسی ریٹائرڈ افسر نے انھیں دیا تھا اور اب وہ اسے اپنے نام الاٹ کروانے کے آخری مرحلے پر تھے..... لیکن یہ کیا ہوا..... ان کے مہمان نے وہ گھر اپنے لیے منظور کروا کر اب انھیں اپنا مہمان بنا دیا!!! نیکی کر اور جس سے نیکی کر اسے دریا میں ڈال۔

ہمارے ایک دوست نے اپنی پریشانیوں کی ڈرامائی داستان سنا کر ہم سے دس دن کے لیے قرضہ لیا۔ ہم نے کوئی دو ماہ بعد یاد دہانی کا سلسلہ شروع کیا تو وہ بولے: ''آپ کو تو بس ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ نے اپنی بہت سی اہم ذمہ داریوں کو نہ نبھانے کی قربانی دے کر مجھے رقم دی تھی لیکن آپ کو دوسروں کا بھی سوچنا چاہیے۔ میں کیا بتاؤں کہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔ میں نے اپنے دفتر کے ساتھ والی عمارت بھی خرید لی ہے اور صرف بیعانہ ادا کیا ہے باقی رقم کا بندوبست کر رہا ہوں۔ گھی مل لگا رہا ہوں اور ابھی اس کا دس فیصد کام باقی ہے۔ مارکیٹ میں دو دکانیں سستی بک رہی تھیں، ان کا بھی ایک ماہ کے اُدھار پر سودا کر چکا ہوں۔ اپنے گھر کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کروائی ہے، چھٹیاں منانے ہمارا خاندان صرف لندن جا سکا ہے حالانکہ اس دفعہ امریکہ جانے کا پروگرام تھا۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہے پھر بھی آپ کو ہمارا کوئی احساس نہیں۔'' ہم نے جواب دیا کہ ''بھائی گھی مل، دفتر، دکانیں تو آپ کی مستقبل کی سرمایہ کاری ہے۔ ہم نے اپنا پلاٹ بیچ کر آپ کو قرض دیا تھا تو آپ کو بھی ہمارے جذبے کی قدر کرنی چاہیے۔'' ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ انھوں نے کسی کو یہ قصہ سنا کر تبصرہ کیا کہ وہ ہماری طرح کم عقل تو نہیں ہیں! یہ سچ ہے کہ جو شخص کسی ہمدم کو پہلی دفعہ دھوکا دے تو قصور اس شخص کا ہے لیکن اگر وہ دوبارہ فریب دینے میں کامیاب ہو جائے تو پھر وہ ہمدم ہی احمق کہلائے جانے کا مستحق ہے!

نجم اپنی ذاتی تقریبات میں اپنے غریب رشتہ داروں اور جاننے والوں کو مدعو نہیں کرتا۔ کسی نے اس بابت استفسار کیا تو بولا: ''اسی لیے کہتے ہیں کہ جس سے نیکی کرو، اسے دریا میں ڈالو۔ میں تو انھیں اس لیے تکلیف نہیں دیتا کہ قیمتی کاروں کے ہجوم میں وہ رکشے سے اترتے ہوئے خود کو احساس کمتری کے کیچڑ میں گرتا ہوا محسوس کریں گے۔ پھر تقریبات کی مناسبت سے تحفہ دینا ان کی مالی بساط سے باہر ہے کیونکہ شاعر نے کیا خوب بات کہی ہے:

کسی کو تحفہ جو دینا تو قیمتی دینا
کسی کو پیشِ محبت میں پھول مت کرنا

دوستی کے اس ماڈرن ایڈیشن کی بابت ہمارے شناسا عامر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آج کل کے بیشتر دوست اخبار کی طرح رپورٹنگ کرتے ہیں۔ اگر کسی دوست کو کوئی کامیابی ملی تو دوسروں کو بتا دی اور اگر کوئی ابتلا میں مبتلا ہوا تو اس خبر کو دوسروں تک پہنچا دیا یعنی اس تعلق میں ان کا رول بطور تماشائی ''بہت افسوس ہوا'' یا ''بہت خوشی ہوئی'' تک محدود ہوتا ہے یعنی:

حذ ادب کی بات تھی، حذ ادب میں رہ گئی
میں نے کہا کہ "میں چلا"، اس نے کہا کہ "جائیے"

نئے زمانے کے دستور میں جلتی ہوئی آگ کے الاؤ کے قریب سے گزرنے والوں کو اس میں بھسم ہوتے ہوئے دوست کہیں نظر نہیں آتے۔ ہاں اب معقول اور اچھے رفیق کی پہچان یہ ہے کہ وہ آتش کدے کے باہر ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے اپنے ساتھی کا منتظر ہوتا ہے۔ اگر وہ بچ گیا تو ہار اس کے گلے میں ڈال کر استقبال کر لیا اور اگر جل گیا تو یہی پھول تعزیت کے طور پر مٹی کے ڈھیر پر سجا دیئے۔ یہاں دوست گلے نہیں ملتے بلکہ عہدے عہدوں سے، دولت دولت سے اور مفاد ضرورتوں سے گلے ملتے ہیں اور اگر ضرورت نامی مونث زیادہ ضروری ہو تو فریقین کا الگ وجود دکھائی ہی نہیں دیتا۔ انسانیت نام کی چیز تو کبھی کی مرکھپ چکی! ہم نے مرزا سے پوچھا کہ ان صاحب کا کیا حال ہے جن کا تم نے اپنے یارِ غار کے طور پر تعارف کروایا تھا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ شخص تو کسی آفت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے میں بڑے عرصے سے اس سے دور ہی رہتا ہوں۔

ایک شخص نے اپنے دوست کو خط لکھا "میں بہت پریشان ہوں کیونکہ بہت عرصے سے تمھاری خیریت کی اطلاع نہیں ملی۔ مجھے کچھ رقم کی بھی ضرورت ہے۔ پچاس ہزار روپے کا بنک ڈرافٹ فوراً بھجوا دو تاکہ مجھے تسلی ہو جائے کہ تم ہر طرح خیریت سے ہو اور اپنے پرانے یار کو بھولے بھی نہیں۔" آپ کو آج کل اس طرح کے لوگ بھی مل جائیں گے جن کے جاننے والے کے پاس اگر کار ہو تو وہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ یہ دعا مانگتے پائے جاتے ہیں: "خداوندِ کریم اگر اس کو ایک کار دی ہے تو مجھے دو کاریں دے دے اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس کی کار کا حادثہ ہی کروا دے کہ اس میں تو کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا۔"

آج معاشرے میں ہر طرف کارپوریٹ کلچر کا طوطی بول رہا ہے اور یہ کلچر ہمارے سماجی رویوں میں بھی جاری وساری ہو چکا ہے۔ دوستیوں میں بھی متوقع فائدے نقصان کے پیشِ نظر رائٹ سائزنگ اور ڈاؤن سائزنگ ہوتی رہتی ہے بلکہ بہت سے سیانے لوگ تو ڈسپوزیبل (Disposable) تعلقات میں یقین رکھتے ہیں کہ حسبِ ضرورت ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرو اور پھر پھینک دو!! ایک ایسے دکاندار سے کسی نے کاروباری حالات کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ سخت مندہ ہے، صبح سے ابھی تک کوئی واقف ہی نہیں آیا!

محفل میں کسی نے کہا کہ ٹوٹی ہوئی دوستی جڑ تو جاتی ہے لیکن پھر اس میں وہ مضبوطی نہیں ہوتی تو شوکت صاحب بولے کہ اسی لیے وہ دوستی کا گھر لچکدار ربڑ سے بناتا ہے جسے کوئی زلزلہ بھی نہیں گرا سکتا۔ اس پر کسی نے تبصرہ کیا کہ بھائی پھر اس مکان میں آپ اکیلے ہی رہتے ہونگے کیونکہ ربڑ کا گھر رہائش کے قابل نہیں ہو سکتا!

یہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جن کے سارے دکھ اپنی جھولی میں سمیٹ کر آپ اپنی خوشیاں ان کو دے دیتے ہیں اور یہ اس قربانی کو اس طرح نہیں بھولتے کہ آپ نے ان کو جتنی پریشانیوں سے بچایا تھا، وہ آپ کو لوٹا دیتے ہیں! پرانے زمانے میں یہ بات اکثر سننے میں آتی تھی کہ ہم ان سے کیسے لڑ سکتے ہیں، انھوں نے ہمارے والد صاحب کے جنازے کو کندھا دیا ہوا ہے۔ آج کل اس طرح کے احسان کا بدلہ متعلقہ شخص کے جنازے کو جلد کندھا دینے کی خواہش سے کیا جاتا ہے! ہمارے ایک دوست نے سوال کیا کہ میرے احسان فراموش بہت اکٹھے ہو گئے ہیں، ان سے کیسے نجات پاؤں تو ہم نے جواب دیا کہ پیارے ان بے وفاؤں سے نجات پانا بہت دشوار ہے کیونکہ ابھی تک ایسا کوئی قبرستان دریافت نہیں ہو سکا جس میں ان کو دفن کیا جا سکے۔ یہ طرفہ تماشا ہے کہ ایسے لاشے کندھوں پر نہیں بلکہ روح پر اٹھائے جاتے ہیں اور یہ بوجھ جسم سے زیادہ آتما کو گھائل کرتا ہے اور پھر اس مسافرت کا راستہ ان جان لیوا دلدلوں سے گزرتا ہے جہاں قدم آگے بڑھانے کی کوشش میں انسان نیچے دھنستا چلا جاتا ہے۔ اس ماحول میں دوستوں پر اندھا اعتماد کرنے والے کی واضح نشانی یہ ہے کہ اس کی کمر میں خنجر پیوست ہوتا ہے:

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

مصیبت اور ابتلا کی گھڑیوں میں غم گساری اور چارہ سازی نہ کرنے والے ساتھیوں کا رویہ جس کرب کا باعث بنتا ہے اس میں سانس تھمتی ہوئی اور دل کی دھڑکنیں رُکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیونکہ یہ عذاب اس اذیت سے بھی زیادہ دردناک ہوتا ہے!

یہ مضمون یہاں تک لکھا گیا تھا کہ ہماری چشمِ تصور میں ہمارے ایسے اچھے دوست اُبھرنے لگے جن کے بغیر ہماری زندگی نامکمل رہ جاتی۔ ہم ان شخصیات سے دوستی کے بارے میں اپنے منفی خیالات کے لیے معذرت خواہ ہیں اور اگلے مضمون میں شناسائی کے مثبت پہلوؤں کا تذکرہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

''شیشہ اور سنگ''

سیما پیروز

یہ تب کی بات ہے جب ابھی اس نے خواب گاہ کی دہلیز اُلانگی نہیں تھی۔ اورنج جوس سے لبالب بھرے بلوریں گلاس ٹرے میں لیے خواب گاہ کے باہر ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ دبیز پردوں نے اس کے وجود کو ایسے چھپا لیا تھا جیسے ماں اپنے بچوں کے عیب چھپاتی ہے۔

یکا یک جیسے تیز آندھی کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اس کا وجود جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ وقت کا پہیہ اُلٹا گھوم رہا تھا۔ سڑاک...... سڑاک ہنٹروں سے ادھڑتی کسی کی کھال، سردار گلباز خان کی حویلی، ایک سہما کانپتا بارش میں بھیگی کبوتری کی طرح...... سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹا کسی مہربان کی اوٹ میں چھپا ایک وجود، کانوں میں سیسہ انڈیلتی ایک آواز...... ننگ خاندان! لے جاؤ اسے ہماری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ آج سے تم ہمارے لیے مر چکے ہو۔ نکل جاؤ اس گھر سے آج کے بعد ہمیں اپنی شکل نہ دکھانا۔ ایک شیر جیسی دھاڑ میں فرمان جاری ہوا تھا۔

بیس برس پہلے سردار گلباز خان کی بلند و بالا ستونوں اور شان و شوکت والی حویلی کا پائین باغ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف قیمتی صوفے اور کرسیاں گولائی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان سے ذرا آگے فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دبیز قالینوں میں پاؤں دھنس رہے تھے۔ ان پر بچھی سفید دودھیا چاندنیوں پر جابجا سرخ، سبز اور اودے رنگوں کے گاؤ تکیے عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ شیشے کی میزوں پر کرسٹل کے گلدانوں میں موسمی پھول خوشبو بکھیر رہے تھے۔ روشنی کا ایسا اعلیٰ انتظام کہ چاہو تو گری ہوئی سوئی ڈھونڈ لو۔

سردار گلباز خان نے اپنے پہلے پوتے کی رسم عقیقہ پر اس جشن کا اہتمام کیا تھا۔ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں میں نمایاں ہونے اور اپنی دولت و ثروت کی دھاک بٹھانے کے لیے مشہور گانے والی ماہ نور کو بلایا تھا۔ بزرگ ذرا قاعدے قرینے میں تھے لیکن نوجوان رئیس زادے خوب کھل کھیل رہے تھے۔ گرما گرم کبابوں کے طشت آ رہے تھے۔ سنہری نقرئی جاموں میں شراب پیش کی جا رہی تھی۔

یہ سب شان و شوکت دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ پاکستان غریب ملک ہے۔ اس ملک کو آزاد ہوئے پون صدی ہونے والی ہے لیکن آج بھی نواب، وڈیرے، جاگیردار، پیر صاحبان اور فوجی اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے ہجرت کا دکھ جھیلا، پورے پورے خاندان کی جان، مال اور آبرو کی قربانیاں دیں ان میں سے بیشتر کی آنے والی نسلیں تک غریبی کے سمندر میں غرق ہیں اور عیش وہ لوگ کر رہے ہیں جن کا اس ملک کو بنانے میں کوئی حصہ نہیں۔

سازندے، زمرد بائی اور اس کی نوچیا آ کر قرینے سے بیٹھتی جا رہی تھیں اور پھر جیسے میر کا شعر مجسم ہو کر نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

چھن چھن کر مدھر آواز پر سب کی پر اشتیاق نظریں اُٹھیں تو پھر اُٹھی ہی رہ گئیں۔ لوگ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ ان کے سانس جیسے سینوں میں رک سے گئے۔ ستاروں کے جھرمٹ میں گویا چودھویں کا چاند طلوع ہو گیا تھا۔

پوتھ سلک کا سفید چوڑی دار پاجامہ (جس میں کہیں کہیں سنہری پھول ٹکے ہوئے تھے) جو اس کی متناسب اور سڈول پنڈلیوں کی شان بڑھا رہا تھا۔ گلابی اور سفید شیفون کی گھیر دار پشواز جس کے گلے اور دامن پر نقشی اور دبکے کا سنہرا کام، گھیرے پر طاؤسی رنگ کی گوٹ، سر پر سفید ستاروں بھرا دوپٹہ، کانوں میں کندن کے راج ہنس جیسی گردن کو چھوتے ہوئے مگر گلے میں کندن کا ہی گلوبند۔ چاند سی پیشانی پر بندیا، سڈول گورے بازوؤں میں کانچ کی چھن چھن کرتی چوڑیاں، کنول جیسے سفید پاؤں میں پازیبیں، پیروں کے ناخن اور ہاتھوں کی پوریں مہندی سے گل اناری ہو رہی تھیں۔ مرد تو مرد چلمن کے پیچھے بیٹھی عورتیں بھی دم بخود دیکھ رہی تھیں۔ یہی سولہ سنگھار کہلاتا ہوگا۔ ہم جو پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں وہ کیا ہے؟

رنگ کیا تھا جیسے میدہ اور سیندور گوندھ کر اس کا پیکر تراشا گیا تھا اور وہ شنگرفی قاتل ہونٹ جو کٹیلی اور ہلکی ہی طنزیہ مسکراہٹ لیے ہوئے تھے۔ ان کی کوئی مثال تھی ہی نہیں اور وہ آنکھیں تو بنی ہی اس لیے تھیں کہ جس پر اُٹھیں اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فرصت سے بنایا تھا ماہ نور کو۔ اس نازنین کا نام جس کسی نے بھی رکھا تھا بہت سوچ کر رکھا تھا۔

ماہ نور نے گانا شروع کیا۔ کیا مدھر اور سریلی آواز تھی۔ ناچنے والی نے بھی کمال کا رقص کیا۔ محفل جھوم جھوم اُٹھی۔ بیرے مشروبات کی ٹرے اُٹھائے مسلسل گھوم رہے تھے۔ کولڈ ڈرنگ کم اور انگور کی بیٹی زیادہ سرو ہو رہی تھی۔ رقص، آواز اور شراب کے سرور سے نوجوان آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ دو تین گانوں کے بعد رقص کرنے والی بیٹھ گئی تو ماہ نور نے ایک غزل شروع کی۔ دو غزلوں کے بعد ہی لوگ بور ہونا شروع ہو گئے۔ ''بھئی کوئی چلتر سا گانا سنائیے جس کے ساتھ رقص ہو سکے۔''

سامنے صوفے پر بیٹھا نیوی بلیو شلوار قمیض والا لڑکا اُٹھا اور ہزار کا نوٹ ماہ نور کے سر پر رکھ دیا۔ ماہ نور نے سر جھٹک کر نوٹ نیچے گرا دیا۔

''اس مجسم قیامت کا بھی رقص ہو جائے۔'' لڑکے نے ماہ نور کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چھوڑیے ہمارا ہاتھ! آپ کو جرأت کیسے ہوئی ہمارا ہاتھ چھونے کی۔'' ماہ نور نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ

چھڑالیا۔
''کمال ہے بھئی! تم کون سی شریف زادی ہو جس کا ہاتھ چھونے سے توہین ہوگئی۔ اب تو مجھے بھی ضد ہوگئی ہے جب تک رقص نہیں کرو گی ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔''
وہ بدتمیزی پر اُتر آیا۔ سب لوگ ہنس ہنس کر اسے شہہ دے رہے تھے۔ اچانک کالے سوٹ میں ملبوس ایک وجیہ لڑکا تیزی سے اُٹھا اور بدتمیز لڑکے کو گھسیٹ کر واپس لایا اور ماہ نور سے معذرت کی۔ ماہ نور ناراض ہوکر اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ محفل بدمزہ سی ہوگئی۔ بصد منت اسے منا کر لایا گیا۔ وہ اس شرط پر واپس آئی کہ وہ اپنی پسند سے گائے گی۔
اس نے ایک غزل شروع کی ''ہم ہیں متاع کوچہ وبازار کی طرح''
وجیہ لڑکے کو لگا جیسے اس کی لمبی پلکوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ شاید وہ رو کر آئی تھی۔ لڑکے کا دل دکھی ہوگیا۔ بلاوجہ کسی کو ذلیل کرنا یہ کہاں کی انسانیت ہے۔ وہ کافی دیر کڑھتا رہا۔ اس محفل سے ہی اس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ سردار گلباز خان کے تینوں بیٹوں میں سے سردار شہباز خان سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹھا تھا۔ دونوں بڑے تو باپ کی طرح سیاست، شکار، شراب اور شباب کے رسیا تھے لیکن شہباز ذرا فرق عادات کا مالک تھا۔ ایچیسن سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ضد کر کے انگلینڈ پڑھنے چلا گیا۔ ایم بی اے کی ڈگری لے کر لوٹا تو Lums میں پڑھانے لگا۔ سردار صاحب اس سے خوش نہیں تھے۔ انہیں اس کی سادہ سی عادات پر اعتراض تھا۔ وہ اسے سیاست میں لانا چاہتے تھے پر اس نے صاف انکار کر دیا۔
شہباز سنجیدہ تو ہمیشہ سے تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ زیادہ ہی خاموش ہوگیا تھا۔ سب گھر والوں نے اس کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا اور اس سے خاموشی کا سبب جاننا چاہا۔ پر مصیبت تو یہ تھی کہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس طرح اُداس کیوں ہے؟
اس روز کھانے کی میز پر سب نے اسے گھیر لیا۔ ماں نے بڑے پیار سے پاس بٹھالیا۔ ''ماں صدقے اتنے چپ چپ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے! کوئی نقصان ہوگیا ہے؟''
''نہیں ماں جی ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ کا وہم ہے۔ میں تو ہمیشہ سے ایسا ہوں۔''
بڑی بھابھی شرارت سے بولی ''کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے؟''
''بولو نا یار! کچھ تو کہو'' بڑے بھائی نے پیار سے اس کے بال بکھیرے۔
''آپ لوگ مجھے بولنے کا موقع دیں تو بولوں نا! آپ سب نے خود ہی میری خاموشی کو مختلف معنی پہنا دیے ہیں۔ آپ سب کی تسلی کے لیے بتادوں کہ کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے تمام مفروضے غلط ہیں۔''
رات بستر پر لیٹا تو سب کی باتیں یاد کر کے مسکراتا رہا۔ بڑی بھابھی کی بات پر چونکا ضرور تھا۔ لڑکی پسند آنے یا نہ آنے کے بارے میں تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ پر وہ ایک لڑکی کے لیے دکھی ضرور تھا۔ کتنی معصوم تھی۔ کتنی شرارت تھی اس کے چہرے پر۔ تقدیر نے اسے کہاں لا پھینکا تھا۔ کیا پتہ وہ اپنے ماحول سے خوش ہی ہو۔ میں بلاوجہ اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اگر وہ خوش ہوتی تو اس کی آنکھوں سے اتنا گہرا دکھ نہ جھلک رہا ہوتا۔
زیادہ پریشان ہوا تو اپنے بچپن کے دوست اور کزن کے پاس چلا آیا۔ پر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ بات کا سرا کہاں سے پکڑے۔ ''کیا بات ہے؟'' اسد نے خود ہی بات شروع کی۔ ''کچھ پریشان لگتے ہو۔ مجھ سے کھل کر بات کرو۔ تمہارا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی ہوں۔ مجھے معلوم ہے گھر میں سب لوگ تمہاری غیر معمولی خاموشی کو لے کر پریشان ہیں۔''
''یار گھر والے تو ایسے ہی بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔ بس آج کل ایک اُلجھن میں گرفتار ہوں۔ شاید تم مجھے اس گرداب سے نکال سکو'' وہ بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔
''میں ہمہ تن گوش ہوں'' اسد ذرا شہباز کے نزدیک ہوکر بیٹھ گیا۔
''پچھلے ماہ کا ہمارے گھر کا جشن تمہیں یاد ہے نا۔''
''ہاں بھئی یاد کیوں نہیں ہوگا۔ کیا زبردست انتظام کیا تھا تایا جان نے۔''
''اس میں ایک گانے والی آئی تھی۔'' شہباز نے بے تابی سے اس کی بات کاٹی۔
''وہ جو گلابی ساڑھی والی تھی''
''نہیں بھئی! وہ جو سفید لباس میں تھی، جو رُوٹھ کر چلی گئی تھی۔''
اسد اس کو انتہائی غور سے دیکھ رہا تھا ''تم اس کا گانا سننا چاہتے ہو؟'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔
''تم اچھی طرح جانتے ہو میں ان خرافات سے دور ہی رہتا ہوں۔''
''پھر کیا دل آ گیا ہے اس ماہ جبین پر؟''
''نہیں یار ایسی کوئی بات نہیں۔''
''پھر مسئلہ کیا ہے؟ پتہ تو چلے۔''
''بس یار کیا کہوں! وعدہ کرو میرا مذاق نہیں اُڑاؤ گے۔'' وہ جھینپ کر بولا۔
''وعدہ رہا...... بھلا میں تمہارا مذاق کیوں اُڑاؤں گا۔'' اسد نے اسے یقین دلایا۔
''تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہیں؟''
''خاص طور پر آنکھوں پر تو غور نہیں کیا۔ ویسے وہ بے حد خوبصورت تھی۔ اسد کے لہجے میں حیرت تھی لیکن تمہاری کیا پرابلم ہے؟''
''صورت شکل تو جو تھی سو تھی۔ مجھے تو وہ بھیگی بھیگی آنکھیں بھلائے نہیں بھولتیں جیسے سطح آب پر جلتے ہوئے دیے۔ جانے کیا تھا ان آنکھوں میں۔ ان کہا درد، زمانے سے شکوہ یا کوئی مجبوری۔ پتہ نہیں بیچاری کن حالات میں وہاں پہنچی ہوگی۔ کسی نے دھوکا دیا یا پھر انہی بدنام گلیوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔ تم نے دیکھا نہیں کتنی شرافت تھی اس کے چہرے پر۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کرسکوں۔''
اسد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر قہقہہ لگا کر بولا ''گانا تم اس کا سننا نہیں چاہتے۔ شکل وصورت شاید

یاد نہیں۔ خالی آنکھوں کا اچار ڈالو گے۔''

''اُڑا لو میرا مذاق! میں تو تمہارے پاس آیا تھا کہ تم مجھے کوئی حل بتاؤ گے۔'' شہباز روٹھ سا گیا۔

''میں چلتا ہوں''

''ارے بیٹھو میرے سادھو...... چلو ایسا کرتے ہیں۔ تمہاری کنول نینی کے ہاں چلتے ہیں۔ جی بھر کر ان آنکھوں کو دیکھ بھی لینا۔ جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ بھی لینا۔''

''نہیں بھئی...... میں وہاں نہیں جا سکتا۔ اگر میرے کسی سٹوڈنٹ یا کولیگ کو پتہ چل گیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی اور پھر ابا جان وغیرہ کیا سوچیں گے۔''

''تایا جان تو خوش ہوں گے کہ ان کا بیٹا نارمل ہو گیا ہے اور خاندانی شوق اپنا رہا ہے۔'' اسد نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''بکواس نہیں کرو'' شہباز جھینپ گیا۔ ''کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔''

''تم بے فکر ہو کسی کو ہوا بھی نہیں لگے گی۔ بس تم کل سات بجے خوب بن سنور کر آ جانا۔ پھر کوچہ جاناں چلیں گے۔'' اسد نے ایک آنکھ دبا کر اُسے چھیڑا۔

''تم پکے بدمعاش ہو۔''

شہباز اور اسد کو دیکھ کر زمرد بائی نہال ہو گئی ''زہے نصیب...... آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے۔ چھوٹے سردار صاحبان تشریف لائے۔ آیئے بیٹھیے......''

اسد تو بڑی بے تکلفی سے بیٹھا تھا۔ شہباز کا عالم تو یہ تھا جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گا۔ مارے شرم کے اس کی آنکھیں ہی نہیں اٹھ رہی تھیں۔

''گانا سنیں گے یا رقص سے دل بہلائیں گے۔''

زمرد نے کلے میں پان ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

شہباز کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسد بول اُٹھا ''صرف گانا سنیں گے وہ بھی ماہ نور کا۔''

دھیرے دھیرے اسد کا جانا موقوف ہو گیا۔ پھر شہباز کا آنا جانا لگا رہا۔ گانا کم سنا جاتا دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہتی۔ ''آپ پڑھی لکھی لگتی ہیں؟''

''میں نے کنیرڈ سے بی اے کیا ہے۔''

''گانے کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں؟''

''کتابیں پڑھتی ہوں۔ کلاسیکل گانے سنتی ہوں۔'' شہباز جاتے وقت نوٹوں کی گڈی رکھ کر چلا جاتا۔ زمرد نہال ہو جاتی۔ شہباز کی سو سو بلائیں لیتی۔ اس آنے جانے کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔

ایک روز بولا ''ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مانیں گی۔''

''ہماری ٹریننگ ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہم کسی بھی بات کا برا نہیں مانتے۔''

''یہاں کی عورتوں کی کیا مجبوری ہے کہ یہ ...... میرا مطلب ہے'' وہ اٹک سا گیا۔

''سب سے بڑی مجبوری بھوک، افلاس اور بیماری ہے۔ پیٹ بھوکا ہو تو نہ کوئی اخلاقیات باقی رہتی ہے نہ مذہب نہ سماج۔ جو عورتیں یہاں رہتی ہیں کوئی بھی یہاں شوق سے نہیں رہتی۔ جو یہاں پیدا ہوئیں یا کسی بھی وجہ سے ان بدنام گلیوں میں پہنچ گئیں وہ کہاں جائیں؟ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے کیا کریں؟ کون ان کو عزت کی روٹی دے گا۔ معاشرہ انہیں نفرت سے دھتکارتا ہے۔ ان کوٹھوں کے علاوہ کہیں بھی ان کے لیے جائے اماں نہیں ہے۔'' کافی دیر دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم رہے۔

پھر ماہ نور بولی ''آپ یہاں نہ آیا کریں۔''

''کیوں؟ آپ کو اچھا نہیں لگتا؟''

''آپ اس ماحول میں سجتے نہیں ہیں۔''

شہباز تھوڑی دیر ماہ نور کو دیکھتا رہا پھر بولا ''آپ بھی تو یہاں نہیں سجتیں۔''

''میری تو مجبوری ہے'' ماہ نور کے لہجے میں یاسیت گھلی ہوئی تھی۔

''میری بھی مجبوری ہے۔'' ماہ نور خاموش رہی۔

''پوچھو گی نہیں میری کیا مجبوری ہے؟''

''شاید جانتی ہوں۔ اسی لیے آپ کو آنے سے منع کر رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ ملنا ملانا آپ کی آنے والی زندگی کے لیے پریشانی کا باعث بنے۔ ہم لوگ دو مختلف سیاروں کے لوگ ہیں۔ جو ایک مدار میں گھوم تو سکتے ہیں لیکن آپس میں کبھی مل نہیں سکتے۔ خدا نہ کرے اگر کبھی مل گئے تو تباہی و بربادی یقینی ہو گی۔''

شہباز گہری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ''میں تو برباد ہوں ہی۔ اللہ نہ کرے میری اس منحوس زندگی کی پرچھائیں بھی آپ پر پڑیں۔ آپ بہت نیک اور اچھے انسان ہیں۔ لوٹ جایئے اپنی دنیا میں جہاں خوشیاں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جلد ہی کسی اچھی خاندانی لڑکی سے آپ کی شادی ہو جائے گی۔ ماہ نور آپ کو بھولے سے بھی یاد نہیں آئے گی۔''

''ماہ نور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' شہباز نے پہلی دفعہ بڑی ہمت کر کے ماہ نور کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''خدا کے لیے انہونی باتیں نہ کریں۔ اپنی اور میری حیثیت کے فرق کو کیوں بھول رہے ہیں آپ...... آسمان اور زمین کا ملن کبھی ہوا ہے؟''

''میں ان سب باتوں کو نہیں مانتا۔ اللہ تعالیٰ نے سب انسان برابر بنائے ہیں۔''

''کیچڑ اور مشک کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔'' ماہ نور کی آنکھیں کھارے پانی سے بھر گئیں۔

''پلیز میری بات مان لیں۔ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا۔''

''آپ میرے ساتھ جلنا نہیں چاہتیں۔''

''میرا کیا ہے۔ میں تو پہلے ہی راکھ ہوں۔ مجھے آپ کی فکر ہے۔''

زمرد کے کانوں تک بات پہنچی تو وہ آگ بگولہ ہو گئی لیکن اس نے بڑے پیار سے شہباز سے بات کی۔ ''سردار صاحب آپ کو کیا مصیبت پڑی ہے موری کی اینٹ چوبارے پر لگانے کی۔ رنڈیوں کے ساتھ عزت دار لوگ شادی وادی کا جھنجھٹ نہیں پالتے۔ یہاں وڈیرے، سیاست دان، آفیسر، بڑے بڑے نام والے آتے ہیں۔ کچھ دن عیش کرتے ہیں پھر اپنی راہ لیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے والد، بھائیوں اور خاندان کے لوگوں کے نقش قدم پر چلیں۔''

''آپ یہی چاہتے ہیں نا کہ ماہ نور آپ کی بن کر رہے تو آپ ایسا کریں اس کی نتھ کھلوائی کی رسم رکھیں۔ جب دل بھر جائے تو چھوڑ جائیں۔'' زمرد کے چہرے پر انتہا درجہ کی خباثت تھی۔

شہباز کا منہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ''اگر آپ عورت ذات نہ ہوتیں تو میں اس قدر گھٹیا بات کا منہ توڑ جواب دیتا۔''

''بولیں! کتنی دولت چاہیے آپ کو ماہ نور کے صدقے میں۔ میں ابھی چیک لکھے دیتا ہوں۔ یہ ابھی میرے ساتھ جائے گی۔ ایک بات دھیان سے سن لیں آج کے بعد آپ ہمیشہ کے لیے ماہ نور کی زندگی سے نکل جائیں گی۔'' شہباز غصے کے مارے کانپ رہا تھا۔

''سردار صاحب! دھیرج سے کام لیں۔ میں تو آپ کو آزما رہی تھی۔ آپ تسلی سے گھر جائیں۔ ماہ نور آج سے آپ کی امانت ہے میرے پاس...... آپ کا جب جی چاہے لے جائیں۔'' زمرد بائی نے شہباز کو بہلا پھسلا کر مطمئن کر دیا۔ پھر اس نے بڑے پیار سے ماہ نور کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''میری پگلی نادان بچی! وہ جھوٹ موٹ کی شادی کا ڈھونگ رچائے گا۔ جب دل بھر جائے گا تو چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح پھینک دے گا۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میری جان! کئی یہاں سے سہاگ کے لال جوڑے کی چاہ میں گئیں اور انہیں سفید کفن بھی نصیب نہ ہوا۔ بہت ساری ذلیل ہو کر انہی کوٹھوں کو آباد کرنے چلی آئیں۔''

''نہیں اماں! وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ سچ مچ مجھ سے شادی کریں گے۔''

''پاگل نہ بن۔ وہ اتنے بڑے وڈیرے کا بیٹا اور تو نالی کا کیچڑ۔ بڑے سردار صاحب کو پتہ چلا تو تیری لاش بھی کہیں نہیں ملے گی۔ تو ان لوگوں کو نہیں جانتی۔ میری ایک بات اور بھی پلو سے باندھ لے طوائف...... طوائف ہی رہتی ہے کہیں بھی چلی جائے۔ کوئی بھی روپ دھا لے۔ میری جان کب تک اور کہاں تک جھوٹ بولو گی۔ کبھی نہ کبھی اصلیت ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ دنیا والے تجھے کہاں جینے دیں گے۔ یہ امیر زادے بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تو صرف گانا گاتی ہے۔ تجھے حاصل کرنے کے لیے شادی کا ڈھونگ رچانا چاہتا ہے۔'' شہباز کے داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔

زمرد نے ماہ نور پر ہر حربہ آزما لیا۔ پیار، ڈانٹ، سختی۔ پھول سے بدن پر تڑاخ تڑاخ بید کی چھمک سے اس کی کھال ادھیڑی گئی۔ پر پھر بھی اس کی زبان پر ایک ہی نام تھا اور پھر زمرد بائی کا آخری حربہ۔ اس نے نہایت غصے سے آواز دی۔

''جگو! جاؤ اور چوہدری حاکم دین سے کہو میں ماہ نور کی نتھ کھلوائی کے لیے تیار ہوں۔ میں نے تو اس کی خواہش پر چاہا تھا کہ یہ حرام زادی گانا ہی گاتی رہے۔ پر اس کشتی کو عزت راس نہیں آئی۔''

ماہ نور نے سنا تو وہ ماں کے پاؤں پڑ گئی۔ وہ زار و قطار روتی جاتی تھی۔ ''اماں! مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ بے شک مجھے جان سے مار دو۔ تجھے پنجتن پاک کا واسطہ میری عزت داغ دار نہ کرو۔ مجھے گدھوں کے حوالے نہ کرو۔ مجھے میرے شہباز کے ساتھ جانے دو۔ اگر مجھے یہی بنانا تھا تو مجھے پڑھایا کیوں تھا۔ اماں میں تیری بیٹی ہوں۔ تجھے خدا رسول کا واسطہ میرا سر ننگا نہ کرو۔'' روتے روتے ماہ نور کی ہچکی بندھ گئی۔

نہ جانے زمرد کو یک دم کیا ہوا۔ وہ کانپ گئی۔ اس نے تڑپ کر اپنے پیروں پر گری ہوئی آہ و زاری کرتی ماہ نور کو اٹھایا اور اپنے کلیجے سے لگا لیا اور خود بھی بے تحاشا رو پڑی۔

شہباز اپنے کزن اسد، گواہوں اور مولوی صاحب کے ساتھ فوراً ہی پہنچ گیا۔ نکاح کے بعد زمرد نے ماہ نور کو ایک سفید بے داغ چادر میں سر سے پاؤں تک ڈھانپ کر شہباز کے حوالے کر دیا۔

''میں نے اسے اپنی کوکھ سے تو نہیں جنا پر اس کو میں نے سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ یہ تین سال کی تھی جب کوئی میرے پاس بیچ گیا تھا۔ جانے کس گلشن کا پھول تھی۔ یہ کیچڑ میں پلی ضرور ہے لیکن میں آپ کو حلفیہ کہتی ہوں کہ یہ کنول کی طرح معصوم اور پاک ہے۔''

زمرد نے ماہ نور کو بھینچ بھینچ کر پیار کیا اور آنسوؤں کی برسات میں رخصت کیا۔ جس وقت شہباز ماہ نور کو لے کر حویلی پہنچا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گول کمرے میں شہباز کے والد اور والدہ کے علاوہ سارے افراد خانہ جمع تھے۔ سردار صاحب سخت غصے میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بندوق لے کر جائیں اور زمرد اور اس کی بیٹی کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیں۔ سب نے بڑی مشکل سے انہیں اس انتہائی اقدام سے روکا تھا۔ ماہ نور سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹی سہمی ہوئی بارش میں بھیگی کبوتری کی طرح کانپ رہی تھی۔ سردار صاحب کی کانوں میں سیسہ انڈیلتی آواز نے جیسے اسے پاتال کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔

''لے جاؤ اس گندی نالے کے کیڑے کو۔ میری نظروں سے دور کرو اس دو ٹکے کی ناچنے والی کو۔''

''ابا جی! یہ میری بیوی ہے۔ اس گھر کی عزت ہے۔''

''ننگ خاندان! تمہیں جرات کیسے ہوئی اس غلاظت کے ڈھیر کو لے کر میری حویلی کی دہلیز پار کرنے کی۔ ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔ پھر کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ آج سے تم ہمارے لیے مر چکے ہو۔''

وہ ماں کو ملنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ بھی روتے ہوئے اسے ملنے لگیں تو سردار صاحب کی دھاڑ سے دہل کر وہیں رک گئیں۔ ''اسے ملنا ہے تو پھر میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔ اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ دوسرے لوگ بھی کان کھول کر سن لیں اگر اس ناخلف سے کسی نے کوئی واسطہ رکھنے کی کوشش کی تو اسے بھی عاق کر دوں گا۔''

شہباز نے وہ گھر تو چھوڑا سو چھوڑا۔ اس نے وہ ملک ہی چھوڑ دیا جہاں اس کی ماہ نور کو ذلیل کیا گیا۔ ایک دوسرے کو پا کر وہ اتنے خوش اور مگن تھے کہ انہیں کسی اور کو یاد کرنے یا پچھلی باتیں دہرانے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ماہ نور کو تو گویا سارا جہان مل گیا تھا۔

کرنے والا شوہر، دولت، عزت، کسی چیز کی کمی نہیں تھی ان کی زندگی میں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ پانچ سال ایسے گزرے جیسے پانچ پل گزرے ہوں۔

ادھر کچھ دنوں سے ماہ نور کو چپ سی لگ گئی تھی (وہ سوچ رہی تھی کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا وجود ان کے درمیان ہونا چاہیے)۔ شہباز نے اسکی خاموشی کا سبب پوچھا تو وہ رو پڑی۔

''میں نے آپ کو والدین سے جدا کیا شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم رکھا ہے۔ کاش میں آپ کی زندگی میں نہ آئی ہوتی۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم میری زندگی میں کیسے نہ آتیں۔ اوپر والے نے تمہیں تو زمین پر اتارا ہی میرے لیے تھا۔ رہی بات بچہ نہ ہونے کی تو بھئی جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو ہو جائے گا۔'' شہباز نے اس کے آنسو پونچھے اور تسلی دی۔

ماہ نور وقتی طور پر تو بہل گئی پر بچہ نہ ہونے کی پھانس جیسے اس کے دل میں گڑ گئی تھی۔ راستہ چلتے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر دیوانی ہو جاتی۔ پکڑ پکڑ کر انہیں پیار کرتی، چومتی۔ شہباز اسے منع کرتا ''کسی دن اگر بچے کی ماں نے پولیس کو شکایت کر دی تو حوالات کی ہوا کھاؤ گی۔''

''میں کیا کروں؟ بس مجھے ایک بچہ چاہیے۔'' پاگلوں کی طرح رونے بیٹھ جاتی۔

''یار میں تمہیں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے اسی لیے اس نے ہمیں بچہ نہیں دیا۔ ویسے اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔ اتنے ڈاکٹرز کو دکھا چکے ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں اگر اولاد نصیب میں ہوئی تو ضرور ہوگی۔ اللہ کا شکر ہے ہم دونوں میڈیکلی فٹ ہیں۔''

دھیرے دھیرے ماہ نور نے جیسے صبر کر لیا تھا۔ اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ڈھیر ساری خوشیاں دے کر ایک نعمت سے محروم رکھا ہے۔ اس میں کوئی بہتری ہوگی۔ پر چپکے چپکے دعائیں مانگنا نہیں چھوڑا تھا۔ پندرہ سولہ سال یورپ گھومنے کے بعد شہباز کو سیٹل ہونے کے لیے دبئی بے حد پسند آیا تھا۔ ماہ نور بھی بہت خوش تھی۔ دبئی کی زندگی یورپ سے بالکل الگ تھی۔ دبئی کے مقابلے میں یورپ کے عام لوگ انتہائی سادگی پسند تھے۔ عورتوں کو دیکھ کر ماہ نور کو بہت حیرت ہوتی۔ نہ اعلیٰ لباس نہ میک اپ نہ جیولری۔ صبح سویرے اپنی اپنی نوکریوں پر نکل جاتے شام کو واپس آ کر کھانا کھاتے اور سو جاتے۔ ایسے لگتا جیسے سارا شہر بھی سو گیا ہے۔ سر شام سب دکانیں بند ہو جاتیں۔ سوائے میڈیکل سٹورز وغیرہ کے ویک اینڈ پر شہر میں رونق ہنگامہ ہوتا۔

دبئی میں رات بھر شاپنگ مالز کھلے رہتے ہیں۔ دنیا بھر سے ثروت مند لوگ گھومنے پھرنے اور شاپنگ کرنے آتے ہیں۔ برج العرب مشہور شاپنگ مال، مختلف ملکوں رنگوں اور نسلوں کے لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں گھومتے پھرتے ایسے لگتا جیسے دنیا میں نہ کہیں غربت ہے نہ دکھ نہ کوئی پریشانی۔

ویک اینڈ پر شہباز اسے خوب گھماتا پھراتا۔ تھوڑے دنوں میں ہی ان لوگوں نے کافی سارے مشہور مقامات دیکھ لیے تھے۔ ابن بطوطہ مال واٹر، پارک مال آف امیریٹ وغیرہ۔ ''برج خلیفہ'' دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ کو ماہ نور حیرت میں گم دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی ''انسان کہاں ٹھہرے گا۔''

ماہ نور کو Palm Jumera دبئی کا سب سے خوبصورت اور مہنگا ترین علاقہ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ یہاں بڑے بڑے ایکٹروں، کھلاڑیوں، سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے اپارٹمنٹس ہیں۔ جن کی قیمت کروڑوں میں ہے۔

''اتنی خاموش کیوں ہوگئی ہو؟ سوچ رہی ہو کہ میں کب تمہیں یہاں گھر خرید کر دوں گا۔'' شہباز نے ماہ نور کو چھیڑا۔

''نہیں یار ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو اللہ جی سے شکوہ کناں ہوں کہ اتنا تضاد کیوں ہے اس کی مخلوق میں۔ ایک طرف نان جویں کو ترستے بھوک سے مرتے لوگ اور دوسری طرف یہ لوگ۔ کیسی راس رچائی ہے اس نے۔''

''پگلی یہ میرے تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ وہ سب کا خالق اور رازق ہے۔ وہ بہتر جانتا ہے۔ الٹی سیدھی باتیں سوچ کر پریشان نہ ہوا کرو بس خوش رہا کرو۔ میرے لیے اور اپنے لیے۔'' شہباز نے پیار سے اس کے سر کو تھپکا۔

ایک شام وہ دبئی فیسٹیول میں گھوم رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکی خاتون شہباز سے آ کر لپٹ گئی۔

''بھیا! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ یہ آپ ہیں نا۔'' شہباز نے بھی اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رونے دھونے کا سلسلہ ختم ہوا تو شہباز کو ماہ نور کا خیال آیا۔ شہباز کے کچھ بتانے سے پہلے ہی لڑکی نے ماہ نور کو بھینچ کر گلے لگا لیا۔ ''میری بھابھی''

''کہاں کھو گئے تھے آپ؟ کوئی ایسے کرتا ہے اپنے پیاروں کے ساتھ؟''

''چلو آؤ گھر چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' بچھڑے ہوئے بہن بھائی ملے تو کتاب ماضی کے ورق الٹنے لگے۔

''سچ بتائیں آپ کو کبھی ہماری یاد نہیں آئی۔ آپ ایسے کٹھور تو نہیں تھے۔''

''ماں باپ، بہن بھائی بھلائے نہیں جا سکتے۔ جن حالات میں گھر چھوڑا تھا وہ تو تم جانتی ہی ہوگی۔ ابا جان کے نادر شاہی حکم کے آگے میری کیا مجال تھی۔ میں اگر کبھی پلٹ بھی آتا تو انہوں نے کون سا مجھے معاف کر دینا تھا۔ میری وجہ سے سارے گھر والے زیر عتاب آ جاتے اس لیے میں نے لوٹنے کا خیال ہی چھوڑ دیا۔''

پورے خاندان کا حال پوچھا گیا۔ ماں باپ کے انتقال کا سن کر شہباز کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

''جس دن آپ نے گھر چھوڑا تھا اسی دن سے اماں کو چپ سی لگ گئی تھی۔ نہ ہنستی نہ زیادہ باتیں کرتیں۔ زیادہ وقت عبادت میں گزارتیں۔ پہروں چپ بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی تھیں۔''

''کیا مجھے کبھی یاد کرتی تھیں؟''

''آپ کا نام تو کبھی نہیں لیا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ آپ کی جدائی میں وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھیں۔ بظاہر انہیں کوئی بیماری لاحق نہیں تھی۔ ڈاکٹر بھی ان کا علاج کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے کہ جدائی کے روگ کا کوئی علاج نہیں۔''

''بس کرو۔ مجھ بدنصیب کی وجہ سے ماں اس حال کو پہنچی۔'' شہباز نے رومال میں منہ چھپا کر آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔

''آپ کے جانے کے ٹھیک پانچ برس بعد اُن کی روح کو سکون مل گیا۔ وہ اپنے ابدی ٹھکانے چلی گئیں۔ ماں کے جانے کے بعد ابا جی بالکل بدل گئے تھے۔ زمینوں کا سارا انتظام بڑے بھیا کے سپرد کر کے سب معاملات سے جیسے لاتعلق سے ہو گئے تھے۔ نہ آواز میں وہ گھن گرج رہی نہ دوستوں کی دعوتیں، نہ شکار پارٹیاں۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ ان کا انتقال ہوئے بھی پانچ چھ برس گزر چکے ہیں۔''

''ماہ نور بیچاری مجرم سی بن گئی۔ آپ باتیں کریں میں آپ کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔''

اس نے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔

رونے دھونے سے دل کا غبار جیسے دھل گیا تھا۔ تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی تیرتی رہی۔ پھر شہباز نے خاموشی کو توڑا ''بڑے بھیا، چھوٹے بھیا اور ان کی آل اولاد کیسی ہے؟''

''سب لوگ ٹھیک ہیں۔ سب کے بچے ماشاء اللہ بڑے ہو گئے۔ جوان بوڑھے ہو گئے ہیں۔'' بہن نے فرداً فرداً سب کے بارے میں بتایا۔

''اپنے شوہر نامدار اور بچوں کے بارے میں بتاؤ۔''

''میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ امتیاز ایک آئل کمپنی میں کیمیکل انجینئر ہیں۔ آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

ماہ نور نے ابھی کمرے کی دہلیز پار نہیں کی تھی کہ اپنا ذکر سن کر رک گئی۔

''بیچاری بھابھی تو بچے کے لیے بہت تڑپتی ہو گی۔''

''ہاں پہلے کافی پریشان رہتی تھی۔ شاید اب اس نے صبر کر لیا ہے۔''

''باہر تو بڑے ماہر ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے وہاں نہیں دکھایا؟''

''بہت سے ڈاکٹروں کو دکھا چکے ہیں۔ سب نے یہی کہا کہ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ جب اللہ کو منظور ہو گا تو بچہ ہو جائے گا۔''

''آپ نے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بارے میں نہیں سوچا کبھی۔''

''بس کبھی خیال ہی نہیں آیا۔''

''یہاں بڑی مشہور گائناکولوجسٹ ہے۔ وہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی ماہر ہے۔ سنا ہے نوے فیصد جوڑوں کی مراد بھر آتی ہے۔ میں آپ دونوں کو اس کے پاس لے کر جاؤں گی۔''

''کمال کرتی ہو۔ اب اس بڑھاپے میں بچے پیدا کرتے کیا اچھے لگیں گے۔''

''آپ ابھی سے بوڑھے کیسے ہو گئے۔ بھابھی زیادہ سے زیادہ اڑتیس کی ہوں گی اور آپ پینتالیس کے ہوں گے۔''

''چھوڑو بھی اب نئے سرے سے کیا دل کو جھوٹی اُمیدوں سے بہلانا۔ اتنے سال ہو گئے اگر خدا نے اولاد دینی ہوتی تو ضرور دے دیتا۔ اس میں بھی ہمارے لیے کوئی بہتری ہو گی۔ ویسے بھی ہم دونوں نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے اور اپنی تقدیر پر شاکر ہیں۔''

''نہیں بھائی آپ چاہے لاکھ انکار کریں۔ میں جانتی ہوں بھابھی کبھی انکار نہیں کریں گی۔ آپ کو ان کی خاطر مان جانا چاہیے۔''

''ضد مت کرو۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''دراصل میں...... میرا مطلب ہے...... میں اب تمہیں کیسے بتاؤں۔''

''تو کیا آپ......'' بہن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے شادی کے بعد اپنا آپریشن کروا دیا تھا۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

بہن ایک دو لمحے تو سکتے کی کیفیت میں رہی۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ خاموش رہا۔

''بتائیں نا یہ ظالمانہ اقدام آپ نے کیوں کیا؟ ایک عورت کو ماں بننے کے حق سے کیوں محروم کیا؟'' وہ چیخ پڑی۔

''میں بھی تو باپ بننے کے حق سے محروم ہوا۔ کیا مجھے اس کا دکھ نہیں ہوا ہو گا لیکن زندگی میں کچھ فیصلے کرنے پڑتے ہیں خواہ کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں۔ زمانہ اتنا بے رحم ہے کہ سات پردوں میں چھپی بات کا بھی کھوج لگا لیتا ہے۔ حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آ کر رہتی ہے۔ لوگ بڑے ظالم ہیں دوسروں کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہنا اور پھر انہیں اچھالنا ان کا دل پسند مشغلہ ہے۔ کل کو کوئی ہمارے بچوں کو طوائف زادے ہونے کا طعنہ نہ دے۔ خاص طور پر اگر کوئی بیٹی ہوئی تو وہ ماں کے ماضی کی سزا کیوں بھگتے۔ یہی سب سوچ کر یہ مشکل فیصلہ میں نے کیا تھا۔'' شہباز کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

شہباز کا یہ جملہ گویا بم کا دھماکہ تھا جس نے ماہ نور کی بسی بسائی نگری میں آگ لگا دی تھی۔ پل بھر میں محبت کے آسمان کا روشن ستارا زمین پر گر پڑا اور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس کی ساری کائنات سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر رہا تھا۔ دور کہیں سے زمرد بائی کی آواز آ رہی تھی۔

''میری بات غور سے سنو۔ طوائف...... طوائف ہی رہتی ہے۔ وہ کہیں بھی چلی جائے کوئی بھی روپ وٹا لے۔

کنول نینی نے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی پر ایک آواز مسلسل اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ طوائف...... طوائف۔

ایک چھناکے سے ٹرے اور گلاس ماہ نور سمیت پکے فرش پر گرے۔ بند ہوتی آنکھوں سے اس نے اپنے اوپر جھکے شہباز کو دیکھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کا وجود پاتال کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔

دیوار کے اُس پار

انجینئر ظفر محی الدین

شجاع اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ جواں اور خوب صورت تھا۔ محکمہ تعلیم میں اعلیٰ سرکاری افسر تھا۔ ادب، تاریخ اور فلسفہ سے اُس کو گہرا شغف تھا۔ اُس کا کوئی دن ایسا نہیں تھا جس میں وہ کتاب کی ورق گردانی نہ کرتا ہو۔ اُس نے اُردو کے نامور ادیبوں کے علاوہ دنیا بھر کے ادیبوں کی کتب پڑھ رکھی تھیں۔ تاریخ نویسوں کی تحریروں سے استفادہ کیا تھا اور فلسفیوں نے اُس کی سوچ کو انتہائی لبرل بنا دیا تھا۔ نہ تو اُس کو جادو ٹونے پر یقین تھا اور نہ ہی وہ بھوت پریت کی کہانیوں کو سچ سمجھتا تھا۔ وہ سائنسی اور فلسفیانہ سوچ کا حامل تھا جس میں فرسودہ خیالات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

وہ مختلف حلقوں میں ادبی اور فلسفیانہ بحث مباحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ اُس کے پاس ہر بات کا مدلل جواب ہوتا۔ وہ فریق مخالف کے ذہن کو قائل کرنے کے ہنر سے آشنا تھا۔

اگر اُس کے سامنے کوئی پیر فقیر یا جادو ٹونے کی بات کرتا تو وہ بھڑک جاتا۔ پھر اُس کا لیکچر شروع ہو جاتا۔ کیا سائنس کیا فلسفہ سب کے حوالے دے کر وہ غصے سے کہتا مجھے حیرت ہے انسان چاند اور مریخ سے بھی آگے۔ سیاروں پر قدم رکھ چکا ہے اور ہم اکیسویں صدی میں ایسی جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔

دوسری طرف اسی اکیسویں صدی میں اُس کے سامنے گاہے بہ گاہے ایسے واقعات بھی رونما ہوتے جو اُس کی عقل و دانش سے ماوراء ہوتے مگر اُن کے پیچھے وہ کوئی نہ کوئی سائنسی عوامل تلاش کر لیتا۔ جیسا کہ پچھلے دنوں اُسے بخار ہوا ساتھ ہی سر میں شدید درد تھا۔ اُس نے حسبِ عادت اپنے فیملی ڈاکٹر کو دکھایا۔ کئی دن تک لگاتار اُس نے نسخے کے مطابق ادویات استعمال کیں۔ مگر کسی طرح نہ بخار کم ہوا اور نہ ہی سر کے درد کا آرام آیا۔ وہ احتیاط بھی کر رہا تھا۔ دفتر سے بھی چھٹی لے لی تھی۔ مکمل بیڈ ریسٹ پر تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں اُس کے چچا گاؤں سے شہر کسی کام سے آئے تو انہوں نے سوچا بھتیجے شجاع اور اُس کے اہلِ خانہ کی بھی خیر خبر دریافت کر لوں۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند، تہجد گزار، حافظِ قرآن اور عالم باعمل تھے۔ جب انہوں نے شجاع کو اس قدر بیمار دیکھا اور پتہ چلا کہ کسی دوائی سے فرق نہیں پڑ رہا تو انہوں نے کہا ''بیٹا! میں دم درود کر دیتا ہوں۔ ان شاء اللہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

چچا کا یہ کہنا یوں تھا جیسے شجاع کی دُکھتی رگ پر انہوں نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اگر چہ بیماری اور نقاہت کی وجہ سے اُس سے بولا نہیں جاتا تھا پھر بھی اُس نے اپنا طویل بھاشن مکمل کیا جس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ ایسی باتوں پر ہرگز یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی ایسے کلمات کی کوئی حقیقت ہے۔

شجاع کے چچا علامہ افتخار الدین زندگی کی 80 بہاریں دیکھ چکے تھے۔ سرد و گرم سے آشنا تھے۔ نہایت بردبار، تحمل مزاج انسان تھے۔ انہوں نے بھتیجے کی باتوں کا بالکل برا نہیں منایا۔ بلکہ نرمی اور شگفتگی سے صرف اتنا کہا ''نہ تو میں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے نظریات تبدیل کرو اور نہ ہی میں تمہیں دوا دارو سے روکتا ہوں۔ بس تم مجھے اللہ اور اُس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے چند کلمات پڑھ کر پھونکنے دو آخر اس میں کیا حرج ہے۔''

چچا علامہ افتخار الدین کے لہجے میں وہ تاثیر تھی کہ شجاع کوشش کے باوجود انکار نہ کر پایا۔ چچا نے اُس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر کچھ سورتیں پڑھ کر پھونک دیں۔ مسجد سے اذان ہوئی تو وہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ شجاع کو نیند آ گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بالکل نارمل تھا۔ جسم میں بھی نہ درد کی شدت تھی نہ بخار۔ پتہ چلا کہ چچا نے عصر اور مغرب کی نماز کے بعد بھی سورتیں پڑھ کر پھونکی تھیں۔ اُس نے جب چچا کا پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو اُس کی بیوی نے بتایا وہ گاؤں چلے گئے ہیں۔ شجاع کو اس طرح چند کلمات کے پھونک دینے سے ٹھیک ہو جانے کی بات پر کچھ دیر کے لیے حیرت تو ہوئی مگر اُس نے اس خیال کو اس دلیل کے ساتھ جھٹک دیا کہ یہ اتنے دن کی ادویات کھانے کا اثر ہے۔ چونکہ ہم اینٹی بائیوٹک کھا کھا کر عادی ہو چکے ہیں اس لیے اب ادویات دیر سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ وہ زیر لب بڑبڑایا ''یہ کیا بات ہوئی کہ چند لفظ پڑھ کر پھونکیں اور بیماری جاتی رہے۔ لفظوں کا بیماری سے کیا تعلق۔ وہ کیسے جراثیم کش ہو سکتے ہیں۔''

وقت گزرتا رہا۔ ایک روز جب وہ دفتر کے معمول کے کاموں میں مصروف تھا فون کی بیل بجی۔ اُس نے ریسیو کیا تو اُس کی بیوی نہایت گھبراہٹ کے عالم میں کہہ رہی تھی:

''جلدی گھر آئیں، فوراً ایان کو کچھ ہو گیا ہے۔''

شجاع نے گھبرا کر پوچھا ”کیا ہو گیا ہے میرے بیٹے کو؟“

تو اُس کی بیوی نے جواب دینے کی بجائے رونا شروع کر دیا۔ شجاع سب کام چھوڑ کر فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے گیارہ سالہ بیٹے ایان میں تو اُس کی جان تھی۔ چونکہ وہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے بہت لاڈلا بھی تھا۔ شجاع نہایت گھبراہٹ میں گھر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے ایان بیڈ پر لیٹا ہوا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت اور حیرت ہے۔ اُس کے مُنہ سے رال بہہ رہی ہے اور اُس کے پاؤں مڑے ہوئے ہیں۔ شجاع اُسے لے کر فوراً ہسپتال پہنچا۔ کئی دن تک لگاتار علاج چلتا رہا۔ کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس کو کیا ہوا نہ کسی دوائی سے کچھ فرق پڑا۔

دیکھنے والوں نے بتایا کہ ”بلدیہ کے پاس ایک پیپل کے درخت کے نیچے ایان دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔ اُس درخت پر جنات کا بسیرا ہے۔ وہاں جنات کے بچے کھیلتے ہیں۔ اگر انسانوں کے بچے وہاں کھیلنے آئیں تو انہیں بہت برا لگتا ہے۔ لہٰذا وہ اُنہیں بیمار کر دیتے ہیں تاکہ آئندہ وہاں نہ آ سکیں۔“

شجاع نے یہ باتیں سُن کر دل ہی دل میں کہا یہ کیا بکواس ہے۔ جنات کے بچے کہاں سے آ گئے۔ شہر میں رہنے کے لیے۔

جب اسی پریشانی میں کئی دن گزر گئے تو اپنی بیوی، رشتہ داروں اور چند احباب کے کہنے پر چارو ناچار اُسے چچا علامہ افتخار الدین کو بلانا پڑا۔ وہ آئے تو انہوں نے ایان کو دیکھتے ہی ”لاحولا ولا قوۃ الا باللہ“ پڑھا اور کہا ”یہ تو غیر مسلم جنات کے بچوں کی حرکت ہے۔“

شجاع کے لیے یہ بات انتہائی مزاحیہ تھی کہ جنات میں بھی مسلمان، عیسائی اور ہندو ہوتے ہیں۔ بہر حال وہ چچا کے کہنے پر ایان کو گھر لے آئے۔ تین روز تک علامہ صاحب سورتیں پڑھ کر ہر نماز کے بعد پھونکتے رہے۔ اُس کے گلے میں تعویذ لکھ کر ڈالا۔ پانی پر بھی دم کر کے اُس کے چہرے پر ڈالتے رہے۔ جب پانی ڈالتے تو یوں لگتا جیسے ایان کے جسم سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور اُس کے اندر سے رونے کی شیطانی آوازیں آتیں۔ اُس کی ماں کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ شجاع کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ڈاکٹرز کی مایوسی دیکھ چکا تھا۔ بالآخر وہی ہوا کہ تین دن بعد ایان یوں اُٹھ کر بیٹھ گیا جیسے اُسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ اُس کو اس طرح تندرست دیکھ کر جہاں شجاع کی جان میں جان آئی تھی وہاں اُس کا سائنس پر مکمل یقین بھی متزلزل ہو گیا تھا۔ وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ سب کچھ سائنس نہیں ہے، کچھ غیر مرئی طاقتیں بھی ایک وجود رکھتی ہیں۔ اُس کے فلسفیانہ نظریات کی عمارت گر گئی تھی مگر ابھی اُس کی بنیادیں باقی تھیں۔ اب اُس کے اندر بحث کی وہ قوت نہیں رہی تھی نہ ہی اس کی باتوں میں وہ دم خم تھا۔

چند سال ہی گزرے تھے کہ ایک اور واقعہ رونما ہوا جس نے شجاع کے اوسطان خطا کر دیے۔ اس واقعہ نے اُس کے نظریات پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ ان کی بنیادیں بھی ہلا دیں۔ ہوا کچھ یوں کہ شجاع کی بیوی اچانک ایک روز سکتے میں چلی گئی۔ اُسے سکتے سے باہر لانے کے لیے شجاع کئی ماہ تک ملک کے بڑے بڑے ہسپتالوں مین علاج کراتا رہا۔ مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ سب سینئر ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور اُس بورڈ نے میٹنگ کے بعد لکھ کر دیا کہ یہ بیماری ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ شجاع کی حالت قابل رحم تھی۔ چچا بھی اب اس دُنیا میں نہیں رہے تھے جن کی وجہ سے وہ دو بار بحرانی کیفیت میں سے نکلا تھا۔ آخر اک روز بیٹھے بیٹھے اُسے اُس بزرگ کا نام یاد آیا جس کا اُس کے چچا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ بزرگ انہی کے گاؤں میں رہتے تھے اور چچا علامہ افتخار الدین کے مطابق اُس وقت وہ ولیٔ کامل ہیں۔ یہ خیال آتے ہی شجاع اپنی بیوی اور بچوں کو لے کر فوراً گاؤں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا بزرگ ابھی زندہ تھے۔ اُن کو جب اُس نے بتایا کہ وہ علامہ افتخار الدین کا بھتیجا ہے اور اس پریشانی میں مبتلا ہے تو انہوں نے اُسے تسلی دی۔ سبز رنگ کا رومال پڑھ کر دیا اور کہا کہ یہ اپنی بیوی کے سر پر باندھ دو۔ پانچ وقت نماز پڑھو۔ اللہ سے دُعا کرو ان شاء اللہ سات دن بعد یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ شجاع نے ایسا ہی کیا اور اُس وقت اُس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب سات روز بعد اُس کی بیوی نے اُٹھ کر کہا کہ آپ مجھے یہاں گاؤں کیوں لائے ہیں۔ جب شجاع نے سارا ماجرا بتایا تو وہ بھی حیران رہ گئی۔ پھر سب گھر والے جا کر بابا جی کے مرید ہو گئے۔ انہوں نے کچھ وظائف اور تحائف کا ہدیہ دے کر شجاع کو رُخصت کیا۔

اب شجاع مکمل طور پر بدل چکا ہے۔ نطشے اور فرائڈ کو تو وہ پہلے پڑھ چکا تھا۔ آج کل تصوف کی کتب اور تذکرۃ الاولیاء پڑھنے میں مصروف ہے۔ کیونکہ اُسے یقین ہو گیا ہے کہ اللہ والے دیوار کے اس پار بھی دیکھ سکتے ہیں۔

انٹرویو: منو بھائی

اثر نگ: اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں۔

منو بھائی: میری پیدائش 6 فروری 1933ء کی ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلر شپ ہوئی۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔ اُس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔ میرے دادا امام مسجد تھے لیکن اُن کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔ امامت اُن کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ ان کا نام میاں غلام حیدر تھا۔ انہوں نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ انہی کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے مُنّو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری نظم چھاپی۔

ارژنگ: بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟

منو بھائی: میری پیدائش وزیر آباد کی ہے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔ بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتدا کی۔

ارژنگ: ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگار ٹی وی ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصہ سے آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامہ نہیں لکھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

منو بھائی: موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔ اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔ وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اُتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں جیو کے لیے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔

ارژنگ: پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟

منو بھائی: میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے اور اس شاعری پر مجھے ''پرائیڈ آف پارفارمنس'' ملا ہے۔ میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نہیں آئی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔

ارژنگ: شاعری کے لیے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

منو بھائی: پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لیے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔ میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو''

ارژنگ: شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کون سا تعارف زیادہ پسند ہے؟

منو بھائی: ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں، میں بہتر انداز میں اظہار کر سکتا ہوں۔

ارژنگ: ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبدار ہونا کس حد تک ضروری ہے؟

منو بھائی: میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبداری ممکن نہیں ہے۔ اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کر رہا ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہیے۔ جو چولہے کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے ناانصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ کالم نگار کو چاہیے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

ارژنگ: آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

منو بھائی: آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

ارژنگ: اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

منو بھائی: جو بھی انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو۔ میرے خیال میں وہ ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

ارژنگ: پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

منو بھائی: ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں۔ میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائد اعظم، علامہ اقبال اور قائد اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں۔

انٹرویو: ولی عالم شاہین

س ا۔ اپنے بچپن اور ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتایئے۔

ج۔ میرا تعلق غازی پور ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع ایک گاؤں سے ہے جہاں کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

گاؤں کے وسط میں ایک مسجد تھی جس کے دروازے کے سامنے ایک کنواں تھا جہاں بطور خاص جمعہ کے دن نہانے والوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ایک نہایت متقی نفیس اور شفیق بزرگ مولوی محمد حنیف صاحب مسجد کے امام تھے۔ پورے گاؤں کے علاج معالجے کے لئے حکیم عبدالجلیل صاحب کی خدمات کا سہارا میسر تھا

ایک منظر جو آج تک ذہن پر ثبت ہے وہ ہندوؤں کے ایک ماہ پر محیط تہوار ''بول بم'' سے وابستہ ہے۔ ساون کے مہینے میں، اگست ستمبر کے دوران، سلطان گنج میں گنگا ندی سے پانی لے کر زائرین ننگے پاؤں ایک سو پانچ کیلومیٹر کا دیوگھر (بابا دھام) تک کا سفر پورے بدن کا سجدہ کرتے ہوئے طے کرتے ہیں تا کہ شو جی کی مورتی پر گنگا جل ڈھال کر اپنے انتہائی جذبہء عبودیت کا اظہار کر سکیں۔

میر تقی میر کے شعر:

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کی یہ گویا ایک عملی شکل تھی۔

ہمارے آباء واجداد سب اپنے نام کے ساتھ ''سید'' یا ''میر'' لگاتے تھے۔ میرے والد جن کا نام میر نوید علی تھا اپنے محلے اور اطراف وجوانب میں ''میر صاحب'' کہلاتے تھے۔

سوال ۲: کچھ یادیں زمانہء طالب علمی کی بھی قارئین سے شیئر کیجیے۔

ج۔غازی پور پرائمری اسکول میں چار اساتذہ تھے۔ مولوی اصغر حسین، مولوی عابد حسین، مولوی عبدالرزاق، اور مولوی عبد الشکور۔ اول الذکر ہیڈ ماسٹر تھے۔ عابد حسین صاحب علم الحساب میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ سائنس، ریاضیات، اور بعد میں شماریات سے میری دلچسپی (یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا) میں شاید ان کی دی ہوئی بنیادی تربیت کام آئی ہو۔

انیس سو چھیالیس (۱۹۴۶ء) کے ہولناک ہندو مسلم فسادات سے میں، میری والدہ اور چھوٹے بھائی شہید ہو گئے۔گھر نذر آتش کر دیا گیا اور والد کا کاروبار بھی انہی سانحوں کا حصہ بن گیا۔اس دورِ ابتلا کی سخت آزمائشوں کے باوجود میں اندازاً تیرہ برس کی عمر میں میٹرک سے فارغ ہو گیا۔ بیس برس کا ہوا تو شماریات میں ایم ایس سی کر چکا تھا۔یونیورسیٹی میں اول پوزیشن آئی تھی اور بھاگل پور مارواڑی کالج کے شعبہء شماریات میں لکچرر لگ گیا۔ میں اچھا طالب علم تھا۔ ٹیوشن پڑھا پڑھا کر گزارا کیا۔ کتابیں خریدنے کی سکت نہیں تھی چنانچہ میرا سارا انحصار اپنے کلاس نوٹس پر تھا۔زندگی سے مجھے گلہ نہیں اور خدا کی رحمت سے میں کبھی مایوس نہیں ہوا۔محنت سے جی نہیں چراتا لیکن نتیجے پر میرا یا کسی اور ذی روح کا اختیار نہیں۔

میں بی ایس سی کے آخری سال میں تھا کہ میری شادی ہو گئی۔ روشن آرا میٹرک کر چکی تھیں۔ انہوں نے لڑکیوں کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی جس سے یہ سہولت ہوئی کہ میں نے ایم ایس سی کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ اپنی پڑھائی پر رکھی۔اور یہ سلسلہ چل نکلا۔میرے لکچرر ہونے کے بعد روشن نے سندر وتی مہیلا کالج بھاگل پور سے بی اے کیا اور ۱۹۶۵ء میں ترکِ وطن کے بعد انہوں نے ڈھاکہ یونیورسیٹی میں ایم اے میں داخلہ لیا۔

س ۳: شاعری آغاز کیسے ہوا؟

ج۔مولانا اسماعیل میرٹھی کے قاعدوں میں شامل نظمیں مجھے اچھی لگتی تھیں۔تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا / رب کا شکر ادا کر بھائی / نہر پر چل رہی ہے پن چکی / ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔ یہ اور اس قبیل کی نظمیں اور مفرد اشعار میرے تخیل کو مہمیز کیا کرتے تھے۔ایک دن اسکول کے باہر ایک درخت کی شاخ پر بیٹھ کر میں اچانک گنگنانے لگا:

اسکول چمکتا چم چم چم - مرا نام ولی عالم

پھر اس طرح کے الٹے سیدھے مصرعے ترتیب پانے لگے۔

س ۱۲۔ سید ولی عالم نے ''شاہین غازیپوری'' کا تخلص کس تحریک اور رہنمائی پر اختیار کیا اور پھر اسے ترک کر کے صرف ''شاہین'' تک کیوں محدود ہو گئے؟

ج۔ میں نے ہائی اسکول کے دوران (غالباً ۱۹۵۱ء میں) دو روپے بھیج کر نسیم بک ڈپو لکھنو سے بذریعہ ڈاک اقبال کی کتاب ''بالِ جبریل'' منگوائی تھی۔اسی کتاب سے جو اس وقت مجھے خاصی مشکل معلوم ہوئی تھی میں پہلی بار لفظ ''شاہین'' سے متعارف ہوا اور اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔ اور اپنے گاؤں کے لاحقے سمیت ''شاہین غازی پوری'' بن گیا۔

میرا پہلا شعری مجموعہ ''رگِ ساز'' اسی نام کے تحت ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ برصغیر میں تین غازیپور ہیں۔ یوپی، بہار، اور بنگال میں۔

اول الذکر زیادہ مشہور ہے۔ آخر الذکر تینوں میں کم۔ کچھ لوگ مجھے غازی آبادی بھی لکھ دیتے تھے۔ بار بار کی وضاحت سے بچنے کے لئے میں نے اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک یک لفظی نام ''شاہین'' تک محدود کر لیا۔

س: تخلیق کے حوالے سے آپ کس طرح کی زندگی اور ماحول کو سازگار تصور کرتے ہیں؟

زندگی اور ماحول کے سازگار ہونے کا کوئی ایک پیمانہ

ممکن نہیں۔بعض تخلیق کار ناموافق حالات میں بھی اپنے معمول میں خلل نہیں آنے دیتے۔بعضوں کے ہاں ربندر ناتھ ٹیگور (Rabindranath Tagore: 1861-1941) اور مارسل پروست (Marcel Proust: 1871-1922) کی طرح موروثی وسائل کی فراوانی آسانیاں پیدا کرتی ہے اور انہیں ہما شما کی سی جینے کی شبانہ روز تگ و دو سے واسطہ نہیں رہتا۔ایسے لوگ مکمل طور پر فنا فی الادب ہونے کی عیاشی کی استطاعت رکھتے ہیں۔

میں نے فاقے بھی برداشت کئے۔اچھے دن آئے تو کچھ اچھے کام کئے اور ہر حال میں پروردگار کا شکر ادا کیا۔

س ۳۵۔آج کل اردو شاعری میں تجربات کا بڑا غلغلہ ہے۔آپ نے روایتی شاعری سے ہٹ کر کبھی کوئی تجربہ نہیں کیا؟

ج۔تجربہ صرف تجربے کی خاطر نہیں کیا۔ایک نظم سانیٹ کی صنف میں، ایک ٹرزا ریما (Terza Rima) میں، ایک آزاد غزل میں، اور ایک اکیسی میں اور بس۔ ''اکیسی'' میری اپنی کاوش تھی۔آزاد غزل مظہر امام کے نام لکھی تھی۔میری اپنی نظموں میں ہیئتی تجربے کی مثالوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

س ۳۶۔اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور مغرب کے قیام نے کبھی آپ کو انگریزی شاعری اور ادب کی جانب متوجہ نہیں کیا؟

ج۔ایک بار ٹورنٹو میں سکونت پذیر عزیز دوست بیدار بخت کی نوازش کے طفیل جدید نظم کی آبرو جناب اختر الایمان (۱۹۱۵ء۔۱۹۹۶ء) نے یہاں آٹوا میں ہمیں میزبانی کا شرف بخشا۔بے حد یادگار صحبت رہی۔ان سے میں نے کچھ سوالات کئے جن میں سے ایک یہ تھا کہ اتنے بڑے شاعر اور انعام یافتہ مکالمہ نگار ہونے اور فلمی دنیا سے طویل تعلق رکھنے کے باوجود آپ نے کبھی کسی فلم کے لئے گیت کیوں نہیں لکھا۔جواباً انہوں نے کہا کہ جو کام مجھے نہیں آتا اس میں اپنی ٹانگیں کیوں اڑاؤں۔

سو یہاں بھی یہی قصہ ہے۔شعر گوئی سے اردو میں ہی سروکار رکھا۔انگریزی میں مضامین لکھے۔اردو نظموں کو انگریزی میں منتقل کیا۔کینیڈین انسائکلو پیڈیا میں بھی لکھا۔ریڈیو کارلٹن یونیورسٹی کے لئے ایک سو صفحے کا ادبی مسودہ تیار کیا جو پانچ قسطوں میں نشر ہوا۔موقع ملا تو اسے کتابی شکل دوں گا۔

اپنے انگریزی رسالے اردو کینیڈا (Urdu Canada) کی ادارت کے علاوہ ایک اور انگریزی رسالے Possibilitiis کی مجلسِ ادارت میں شامل رہا۔انگریزی میں ایک کتاب Across Continents مرتب کر چکا ہوں۔ایک اور کتاب زیرِ ترتیب ہے۔

ہاں منہ کا مزہ بدلنے کے لئے انگریزی میں بھی کچھ طبع زاد نظمیں غزلیں لکھیں جن میں سے بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔میری ایک غزل جس کا ترجمہ خود میں نے کیا تھا کینیڈا کی ۱۹۹۴ء کی بہترین شاعری میں، جو چھبیس (۲۶) شاعروں کی تخلیقات پر مشتمل تھی، شمار کی گئی۔

س ۳۲۔آپ کے خیال میں اردو زبان و ادب کا عالمی زبان و ادب میں حال کس نوعیت کا ہے اور مستقبل کس امر کی نشاندہی کر رہا ہے؟

ج۔عالمی زبان و ادب کے تناظر میں بات کرنے سے پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرنا ضروری ہے۔ ابتدائی، وسطانی، اور ثانوی اسکولوں، کالجوں، سرکاری و غیر سرکاری محکموں، اداروں، بازاروں، صنعت و تجارت، لین دین، اور اشتہاروں میں اردو کو رائج کریں، یہی وہ کھیتی ہے جہاں عالمی پیمانے کی فصل اُگتی ہے۔

ماضی قریب میں بکر انعام کی مختصر فہرست میں انتظار حسین کے نام کی شمولیت، ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ میں قرۃ العین حیدر اور ن م راشد کے بارے میں تحریریں اس بات کی گواہی ہیں کہ یہ مٹی بنجر نہیں۔

س ۳۳۔آج کل دنیا میں جو سیاسی، سماجی، اور معاشی کشاکش نظر آتی ہے اس کا انجام آپ کے خیال میں کیا ہونا چاہیے؟

ج۔ہر شخص کو آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہو اور اس حق کے تحت اسے ساری متعلقہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔

ایک نرا شاعر اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے؟ لیکن یہ خوش گمانی بھی بڑی چیز ہے کہ: میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

س ۳۸۔آپ کے گھر آنگن میں اردو زبان و ادب اور شاعری کا پودا کب تک لہلہانے کا امکان ہے؟

ج۔ہمارے چاروں بچے یہیں پلے بڑھے۔ہماری کوشش رہی کہ گھر پر سب اردو بولیں۔کچھ عرصے وہ اردو کے اتواری مدرسے بھی جاتے رہے۔انہوں نے اردو کی فلمیں اور ڈرامے بھی دیکھے۔اپنے اپنے گھروں میں جا آباد ہونے سے پہلے ہمارے ہاں آنے والے برصغیر کے درجنوں ادیبوں شاعروں کی خاطر مدارات میں عملی طور پر حصہ بھی لیا۔لیکن خدا لگتی یہ ہے کہ اردو کو یہاں کے معاشی، معاشرتی، اور ثقافتی مطالبوں میں بہت کم دخل ہے۔سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، ریاضیات اور کھیل کود کے علاوہ ہمارے بچوں کے بچے ٹالسٹائی کے ناول 'اینا کیرینینا' (Leo Tolstoy: Anna Karenina)

اور لی ہارپر کے 'ٹو کل اے موکنگ برڈ'

(Lee Harper: To Kill a Mockingbird)

پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہیں یا اسکول میں کھیلے جانے والے کسی ڈرامے پر اخبار کے لئے تبصرہ لکھتے ہیں تو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔اور بس۔تیسری نسل ہماری نہیں، ہمارے بچوں کی ذمہ داری ہے۔

س ۴۰۔ایک قلم کار کی کامیابی اور ناکامی کا آپ کے نزدیک معیار

کیا ہے۔اپنی بابت اس حوالے سے کیا کہنا چاہیں گے اور مستقبل کے حوالے سے کیا توقعات باندھنا پسند کریں گے۔

ج۔ایک تخلیق کار کا فن کے تئیں اخلاص ہی اس کی کسوٹی ہے۔میں اپنے آپ کو اسی روشنی میں دیکھتا ہوں۔

شاعری

لہو کے دام بھی ظالم سماج چاہتا ہے
ہمارے قتل کا ہم سے خراج چاہتا ہے
تمام آگ اُسی کی تو ہے لگائی ہوئی
محبتوں کے جو رسم و رواج چاہتا ہے
کرے گا غصب وہی، کل، حقوق لوگوں کے
جو اپنے واسطے انصاف آج چاہتا ہے
تمہارے جبر کی یہ مہر بانیاں تو نہیں
سکوتِ شہرِ وفا احتجاج چاہتا ہے
زمین کا نہیں بھوکے کا پیٹ بھرنے دو
کہ اسلحہ نہیں، انساں، اناج چاہتا ہے
جو مستحق نہیں اپنے وجود پر سر کا
وہ سر کے واسطے سونے کا تاج چاہتا ہے
اسی لیے تو کیا نامرد ہواؤں کو
خدا زمین پر خوشبو کا راج چاہتا ہے

بسمل صابری/ساہیوال

لہو کی ڈور میں شعلے پرونا بھی نہیں آتا
وہ ہنستے کس طرح ہیں جن کو رونا بھی نہیں آتا
ہمارے جسم میں آسائشوں کا درد رہتا ہے
ہمیں تو زندگی کا بوجھ ڈھونا بھی نہیں آتا
کسی کو خوشبوئیں کاندھوں پر اپنے لے کے پھرتی ہیں
کسی کی گہری نیندوں تک پچھونا بھی نہیں آتا
محبت کا سمندر پار کرنا کیا سکھاؤ گے
تمہیں تو اپنی آنکھوں میں ڈبونا بھی نہیں آتا
وفا و مہر کی بسمل یہ کیسی کاشت کرتی ہو
کسی کے دل میں اپنا زخم بونا بھی نہیں آتا

بسمل صابری/ساہیوال

جو بھی لمبی تان کے سوئے
اپنا گھاٹا جان کے سوئے
دنیا دھوکہ دے جاتی ہے
کیوں پھر اس کی مان کے سوئے
ساگر سونا ریگ میں لائے
اپنا حصہ چھان کے سوئے
اپنے گھر کو گلشن جانے
بیچ اپنے دالان کے سوئے
سورج جب بھی آنکھ دکھائے
اپنی چادر تان کے سوئے
محنت کا اک جال بچھا کر
پھل پانے کی ٹھان کے سوئے
الٹی گنگا بہہ سکتی ہے
تکیے پر امکان کے سوئے
مشکل ان کا جینا بسمل
مٹنے پر جو آن کے سوئے

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

کچھ اسطرح بھی مرا صبر آزماتے رہو
نظر ملاتے رہو بجلیاں گراتے رہو
عدو کی جان جلانا ہے یوں جلاتے رہو
کہ زخم کھاتے رہو اور مسکراتے رہو
نگل نہ جائے یہ دشوار راستوں کا سفر
حدی کی لے کو سفیرانِ غم بڑھاتے رہو
ہمارا فرض حفاظت کریں اجالوں کی
تمہارا ظرف کہ تم آندھیاں چلاتے رہو
عجیب شخص ہے بارود لے کے بیٹھا ہے
تم آس پاس کی چنگاریاں بجھاتے رہو
جلے شجر پہ پرندے اداس ہیں بزمی
جو ہو سکے تو محبت کے گیت گاتے رہو

سرفراز بزمی/راجستھان، بھارت

یہ کون لوگ ہیں

یہ کون لوگ ہیں جو بستیاں جلاتے ہیں
ہیں کون لوگ جو انساں کا خوں بہاتے ہیں
کسی کے مانگ کا سندور چھیننے والے
ضعیف آنکھوں کا یہ نور چھیننے والے
یتیم بچوں کی آہوں سے یہ نہیں ڈرتے
کہ چیخوں اور کراہوں سے یہ نہیں ڈرتے
یہ جشن لاشوں کے ڈھیروں پہ بھی مناتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں جو بستیاں جلاتے ہیں
خُدا نے سب کو بس انسان ہی بنایا ہے
پھر ان پہ کس لئے حیوانیت کا سایہ ہے
درندگی سے انہیں اتنی کیوں محبت ہے
خلوص و امن کی باتوں سے کیوں عداوت ہے
یہ وحشیوں کی طرح قہقہے لگاتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں جو بستیاں جلاتے ہیں
نہ ان کے ہاتھ میں حیوانیت کا پرچم دے
درندگی کا نہ انکو خدا تو دم خم دے
جہاں سے ظلم کو، نفرت کو تو مٹا یا رب
بھٹک گئے ہیں انہیں راستہ دکھا یا رب
وطن پہ لوگ تو قربان ہو بھی جاتے ہیں
کہاں یہ لوگ کبھی بستیاں جلاتے ہیں
وطن پرستوں کو ان کا تو رہنما کر دے
گلے لگا لیں یہ سب کو وہ حوصلہ بھر دے

دلوں میں ان کے محبت کی روشنی بھر دے
خدایا دور یہ نفرت کی تیرگی کر دے
پرندے شام ڈھلے گھر کو لوٹ آتے ہیں
کہاں یہ لوگ کبھی بستیاں جلاتے ہیں

عطیہ نور/ اتر پردیش، بھارت

اُلجھنوں سے نجات کیسے ہو
دل سے دل تک کی بات کیسے ہو
جب مقدر میں نارسائی ہے
تیرے ہاتوں میں ہات کیسے ہو
ساری دنیا سے جیت سکتا ہوں
تیری یادوں کو مات کیسے ہو
تو ہی جب اُٹھ گیا ہے محفل سے
انجمن میری ذات کیسے ہو
تو نے ڈالی سے جس کو توڑ دیا
پھر ہرا اب وہ پات کیسے ہو

عامر بن علی/ جاپان

بہار کی ایک نظم

بہار کی ایک نظم
زندگی کٹھن تو ہے
بے وطن پرندوں کی
بے زمین پودوں کی
اپنے دیس سے بچھڑے
بدنصیب لوگوں کی
اپنے دیس سے بچھڑے
بدنصیب لوگوں کی
پھر بھی جب بہار آئے
سب پرندے شاخوں پر
چہچہانے لگتے ہیں
پھول کھلنے لگتے ہیں
کم نصیب شاخوں پہ
بے وطن مسافر بھی
مہرباں ہواؤں سے
غم کو بھول جاتے ہیں
چاہے چند لمحے ہی
چاہے چند لمحے ہی
جب بہار آتی ہے
معجزے دکھاتی ہے

عامر بن علی/ جاپان

بات یہ روبرو ہے صاحب سے
شاعری گفتگو ہے صاحب سے
میں تو پوری اسی سبب سے ہوئی
عشق کی آرزو ہے صاحب سے
ہاں محبت نمود ہے میری
مجھ میں ساری نمو ہے صاحب سے
اور جانب یہ اب نہیں اُٹھتی
آنکھ کی آبرو ہے صاحب سے
اک روانی سی ہے محبت میں
آنکھ میں آب جو ہے صاحب سے
ورنہ کب کی بکھر گئی ہوتی
چاک دامن رفو ہے صاحب سے

لبنیٰ صفدر/ لاہور

دل نے پھر یوں تری آواز سنی ہو جیسے
قریۂ جاں میں کوئی یاد ہنسی ہو جیسے
اس طرح عشق سلگتا ہے بدن میں میرے
خیمۂ جاں میں کہیں آگ لگی ہو جیسے
اکثر اوقات مجھے بھیڑ میں یوں لگتا ہے
میری تنہائی مجھے ڈھونڈ رہی ہو جیسے
یوں جدائی میں تری ہم تو جیے جاتے ہیں
تجھ سے ملنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے
جس طرف دیکھوں نظر آتا ہے چہرہ ترا
تیری تصویر نگاہوں میں بسی ہو جیسے
آج کہتی ہے جدائی میں سلگتی آنکھیں
کوئی چنگاری ترے دل میں دبی ہو جیسے
مختصر اتنے تھے پل وصل کے لبنیٰ صفدر
اُس کا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

لبنیٰ صفدر/ لاہور

دامن سے تیرے پیار کی تاثیر باندھ کر
دل خوش ہے اسمِ یار کی زنجیر باندھ کر
پلکوں پہ ٹوٹے خواب کا ملبہ پڑا رہا
یہ کون لے گیا مری تعبیر باندھ کر
اذنِ سفر ہوا تو ہم ایسے عجیب لوگ
جائیں گے ساتھ آپ کی تصویر باندھ کر
اس سے کہو کہ پیار سے جیتے سبھی کا دل
نکلے نہ یوں فضول میں شمشیر باندھ کر
ہم لوگ آنے والے زمانے کے واسطے
رکھ دیں گے اک کتاب میں تحریر باندھ کر
عنبر کہاں نصیب کی اتنی دھنی رہی
اس در پہ لے گئی مری تقدیر باندھ کر

فرحانہ عنبر/ گوجرانوالہ

کل رات خود بجھا کے دیا چیختی رہی
اپنی ہی دھن میں مست ہوا چیختی رہی
ظالم چرا کے لے گئے کلیوں کا بانکپن
گلشن میں بے قرار صبا چیختی رہی

بہروں کے اس نگر سے رہائی نہ مل سکی
گزری جو بام و در سے صدا چیختی رہی
شہرت کی بھوک مشرقی قدریں نگل گئی
دیکھی جو بے حیائی حیا چیختی رہی
مل جائے تیرے دل میں اترنے کا راستہ
حسرت سی کوئی دل میں سدا چیختی رہی
مانگا تھا ایک شخص مگر مل نہیں سکا
دستِ طلب میں ایک دعا چیختی رہی
لوگوں نے تیرگی کو مقدر سمجھ لیا
ورنہ تو ہر قدم پہ ضیا چیختی رہی
باندھا تھا جس کو تو نے محبت کی ڈور سے
عنبر وہ ہو کے تجھ سے جدا چیختی رہی

فرحانہ عنبر/گوجرانوالہ

بے مزہ ہے زندگی تیرے بغیر
نامکمل ہے خوشی تیرے بغیر
پھیکا پھیکا سا بہاروں کا سماں
سونی سونی ہے ہنسی تیرے بغیر
ہو گیا ویران میرا صحنِ چمن
لٹ گئی ہے تازگی تیرے بغیر
روٹھے روٹھے سے ہیں نظارے سبھی
سہمی سہمی آنکھ بھی تیرے بغیر
شہر خاموشاں دکھائی دے مجھے
شہر کی ہر اک گلی تیرے بغیر
شہر سارا پوچھتا ہے کون ہو
ہم تو ٹھہرے اجنبی تیرے بغیر
دیکھ لے تو اے ستمگر دیکھ لے
جی رہا ہوں میں ابھی تیرے بغیر
روند ڈالا گردشِ دوراں نے ناز
مٹ گئی آسودگی تیرے بغیر
نازؔ تھا کیا تیری چاہت پر ہمیں
جل بجھی ہے عاشقی تیرے بغیر

وحید ناز/لاہور

جیسے سُر بنسری میں رہتا ہے
وہ مری زندگی میں رہتا ہے
کاش تم دیکھ سکتے میرے دوست
دکھ جو میری ہنسی میں رہتا ہے
اس کا بھی احترام کرتی ہوں
جو تمہاری گلی میں رہتا ہے
جب سے دیکھا ہے اس نے آنکھوں میں
دل عجب بے کلی میں رہتا ہے
شہر بھر میں تھیں رونقیں جس سے
ان دنوں خامشی میں رہتا ہے
اس لیے کر رہی ہوں رد سورج
دل یہ خوش تیرگی میں رہتا ہے
ہر کسی کو نظر نہیں آتا
جو خدا آدمی میں رہتا ہے
وِردؔ دل کا امیر ہے وہ شخص
ظاہری مفلسی میں رہتا ہے

آمنہ وِرد/لیہ

اس اُداسی کی اب تو دوا دیجیے
دیکھیے دیکھ کر مسکرا دیجیے
حوصلوں کی ریاضت بہت ہے مری
فیصلہ آج اپنا سنا دیجیے
مسئلہ ہے مری روشنی کا اگر
اپنے ہاتھوں سے مجھ کو بجھا دیجیے
جل رہی ہوں ترے ہجر میں رات دن
دور رہ کر نہ مجھ کو ہوا دیجیے
جو بھی دیکھے مجھے آپ کا ہی کہے
رنگ ایسا کوئی اب چڑھا دیجیے
چاہتے ہو پرندے محبت کریں
پیڑ آنگن میں اپنے لگا دیجیے
اس سے پہلے کہ پتھر بنائیں تمہیں
وِردؔ آنکھوں سے غم کو بہا دیجیے

آمنہ وِرد/لیہ

کون رکھے گا تجھ کو گلوں کی طرح
تو بکھر جائے گا خوشبوؤں کی طرح
دیس میں میرے جینا بھی مشکل ہُوا!
ہیں محافظ یہاں قاتلوں کی طرح
راہنمائی میں کس کی چلے قافلہ
رہنما بن گئے رہزنوں کی طرح
چھوڑ دے زندگی اب تو پیچھا مِرا
دوست ملتے ہیں اب دشمنوں کی طرح
دل دُکھاتے نہیں لوگ اپنے کبھی
مجھ سے تو پیش آ محسنوں کی طرح
رب نے سب کچھ دیا ہے تجھے، پھر بھی تو
کیوں پریشان ہے مفلسوں کی طرح
اب کروں ہم سفر کس کو اپنا شفیقؔ
پیش آتے ہیں سب دشمنوں کی طرح

شفیق اعوان/حضرو تحصیل اٹک

سالِ نو اور جاپان

عامر بن علی/جاپان

کرسمس کا دن مسیحی دنیا میں خاندان سے متعلق ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں کرسمس کا عشائیہ اس تہوار کا سب سے اہم اور بنیادی رکن ہوتا ہے۔ جسے تمام لوگ عموماً اپنے اہل خانہ کے ساتھ مناتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہونے کے سبب مذہبی رجحان رکھنے والے خاندان کرسمس کی صبح گرجا گھر جاتے ہیں جہاں خصوصی دعائیہ تقریب ہوتی ہے۔ اس دن ولادت مسیح کے مختلف پہلوؤں پر پادری اپنے اپنے انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ کرسمس اگرچہ اب مذہبی سے زیادہ سماجی تہوار بن گیا ہے مگر پھر بھی اس کا تشخص اور تقدیس اب بھی روحانی نوعیت کی ہے۔ نیوایئر کا معاملہ بالکل ہی مختلف ہے، اس کا نقش رات کے بارہ بجے، باہر سڑکوں پر گھڑی کی بالائی جانب گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیاں اکٹھی ہونے کے انتظار کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آتش بازی اور پٹاخے شروع ہو جاتے ہیں، لوگ شہر کے مرکز میں خوشی سے جھومتے اور نعرے لگاتے ہیں، من چلے نئے سال کے نام جام ٹکراتے ہیں۔ ان ساعتوں میں عشاق پیمانِ وفا باندھتے ہیں۔ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کرسمس ان ڈور اور آمد سال نو کا جشن آؤٹ ڈور تہوار ہیں۔

جاپان میں عیسائی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کی تعداد کل آبادی کا ایک فیصد بھی نہیں ہے، مگر کرسمس ٹری سجے سجائے آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ تمام ہوٹل، شاپنگ مال، دوکانیں، بازار کرسمس کی روشنیوں سے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں میں بالکل وہی جوش وجذبہ نظر آتا ہے جو مسیحی اکثریتی آبادی والے ممالک میں نظر آتا ہے۔ روشنیوں اور رنگوں کا ایک دریا سرِ شام بہنا شروع کر دیتا ہے۔ گو کہ چراغاں کی ابتدا نومبر کے آخر میں شروع ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ جنوری کے اواخر تک چلتا ہے، مگر اس کا نقطہ عروج کرسمس اور نیوایئر ہی ہے۔ کرسمس ٹری کے ساتھ جابجا سانتا کلاز کے مجسمے سجے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سرخ وسفید لباس میں ملبوس، سفید گالا داڑھی اور عینک والے مہربان بزرگ سانتا کلاز کی سواری کی سج دھج، جس میں بچوں کے لیے تحائف لدے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ تحائف سے بھری کوچ اور اس کو کھینچنے والے بارہ سنگھے کے ماڈل جگہ جگہ رنگ و روشنیوں سے منور نظر آتے ہیں۔ بازار سے گزرتے ہوئے سرد ہواؤں کے ساتھ ان دنوں کرسمس اور نئے سال سے منسوب مدھر گیت دور و نزدیک سے سماعتوں سے ٹکراتے ہیں۔ کرسمس ٹری پر سجے لٹکتے آرائشی تحفے، رنگ برنگے ربن میں لپٹے، سرخ اور سبز ڈبوں میں بند اس کرسمس ٹری کے اردگرد بکھرے بہت سے مزیدار تحائف جنہیں بچے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کرسمس اور سال نو کی لوٹ سیل کے تذکرے کے بغیر تو اس موضوع پر بات نامکمل ہی رہے گی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے مذہبی نوعیت کے تہوار اور روحانی ایام کو کاروبار کے ساتھ اس طرح منسلک کیا ہے کہ سارا سال لوگ کرسمس سیل کا انتظار کرتے ہیں۔ جاپان جیسے بدھ مت اکثریتی ملک میں تو کرسمس کے سارے جشن کی بنیادی وجہ ہی کاروباری نوعیت کی ہے۔ اسی کارپوریٹ مفاد کے تحت جاپان میں کرسمس اور نئے سال کی رونقیں مسیحی ممالک کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ ان دنوں کی لوٹ سیل پوری دنیا میں مشہور ہے۔

یہاں یہ تذکرہ بھی قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے کہ مشرقی یورپ اور روس کے علاوہ آرتھوڈوکس عیسائی مسلک کے لوگ جہاں بھی آباد ہیں وہ کرسمس کا تہوار سات جنوری کو مناتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی اس وقت جو کیلنڈر رائج تھا۔ اس کے مطابق یہ دن سات جنوری ہی بنتا ہے۔ بنیادی نقطہ یہ ہے کہ آرتھوڈوکس اور کیتھولک عیسائی نئے سال کے ساتویں دن میلاد مسیح مناتے ہیں، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ سمجھتے ہیں کہ یہ نئے سال سے پہلے یعنی 25 دسمبر کا دن ہے جبکہ روسی، یونانی آرتھوڈوکس اسے گریگورین کیلنڈر کے مطابق 7 جنوری کو مناتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ فلسطین کے جس مقام پر حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی اور اب وہاں کلیسا قائم ہے، وہاں بھی کرسمس 7 جنوری کو منائی جاتی ہے۔

لاطینی امریکہ میں دیکھا کہ دسمبر کے پہلے ہفتے سے ہی کرسمس کے جلوس نکلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ گاڑیوں کے بقافلے ریلی کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سانتا کلاز اور کرسمس سے منسوب مختلف کرداروں کے لباس میں ملبوس لوگ گولیاں، ٹافیاں، اور چاکلیٹ بچوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کے گیتوں کی دھنوں پر جھومتے گاتے لوگ راستے میں ملنے والے لوگوں کی جانب ہاتھ ہلاتے جاتے ہیں اور کرسمس کے تحائف تقسیم کرتے جاتے ہیں۔ رضاکارانہ طور پر ان جلوسوں میں شامل لوگ اپنی گاڑیوں پر غبارے لگاتے ہیں اور میلاد مسیح مبارک لکھوا کر چلتے ہیں۔ جلوس کے راستے میں آنے والے گھروں کی گھنٹیاں بجا کر بچوں کو سانتا کلاز کے لباس میں ملبوس افراد مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ روزانہ نکلنے والے ان جلوسوں کا نقطہ عروج 25 دسمبر ہوتا ہے۔

ان دنوں نئے سال کے کیلنڈروں اور ڈائریوں کے تحائف دفاتر میں روز موصول ہوتے ہیں۔ دوست احباب ان تحائف کا تبادلہ بھی کرتے ہیں۔ محبت کرنے والے ان دنوں نئے سرے سے عہدِ وفا باندھتے ہیں۔ کرسمس پر اگر برفباری ہو جائے تو اسے "وائٹ کرسمس" کہتے ہیں۔ برفباری سے اگرچہ سردی میں تو مزید اضافہ ہو جاتا ہے مگر نوجوان منچلے اس سردی اور برفباری کو انجوائے کرتے ہیں۔ کرسمس اور نئے سال کے درمیانی دنوں میں چھٹی جیسا ماحول ہوتا ہے۔ سرکاری طور پر جاپان میں پچیس دسمبر کی چھٹی نہیں ہوتی اور دفاتر معمول کے مطابق اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ مرزا غالب جن کا یوم پیدائش بھی انہی دنوں، ستائیس دسمبر ہے، جس پر گوگل سرچ انجن نے اس بار 220 ویں سالگرہ پر اپنا صفحہ بطور خراج تحسین غالب کے نام منسوب کیا ہے، کیا خوب اس صورت حال کی ترجمانی اپنے لافانی شعر میں کر گئے ہیں۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ادبی خبریں

✦ عظیم گلوکار اُستاد حسین بخش گلو (پرائیڈ آف پرفارمنس) گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ نامور ادیب اور شاعر مدیرِ اعلیٰ ''نیرنگ خیال'' اور ''اُردو رنگ'' جناب سلطان رشک گزشتہ دنوں رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ نامور ادیب احمد سلیم بھی دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ برمنگھم (برطانیہ) میں کافی عرصہ سے مقیم ''ہجرتوں کے درمیاں'' کے شاعر فاروق ساغر انتقال کر گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ ممتاز کلاسیکل گائیک اُستاد بدر الزماں پرائڈ آف پرفارمنس گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ اُردو اور پنجابی کے شاعر جناب حنیف ساقی گزشتہ دنوں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ 30 اکتوبر کو شاعر قمر صدیقی سرائے عالمگیر میں انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ گزشتہ ماہ شیخوپورہ میں مقیم شاعر اور مذہبی اسکالر ابرار حامد قضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے۔ انہوں نے بیس سے زائد شعری مجموعے اور قرآن فہمی کے حوالے سے دو درجن سے زائد تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ سرائیکی وسیب کی دانش کے روشن چراغ صحافی، دانشور، ادیب و محقق ارشاد احمد امین وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ روزنامہ حسن قلم اور ماہنامہ فرسٹ آپشن کے چیف ایڈیٹر وحید احمد زمان رضائے الٰہی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ○

✦ بزمِ کیفِ سخن کے زیرِ اہتمام مشاعرہ جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کی رہائش گاہ جوہر ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی حمد و نعت اور دوسری غزل کی تھی۔ مشاعرہ میں اقبال رمیض جھنگ)، زاہد قاسم، کامران ناشط، نواب ناظم، حسن عباسی، احمد سبحانی آکاش، رضا عباس رضا، نوید مرزا اور میزبان جسٹس (ر) میاں نذیر اختر نے کلام پیش کیا۔ صدارت اقبال رمیض نے کی۔ نظامت کے فرائض حسن عباسی نے ادا کیے۔ مشاعرہ میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی چنیدہ شخصیات نے شرکت کی۔ سامعین نے شعراء کے ہر اچھے شعر پر بھرپور داد دی۔ اس موقع پر فلسطین اور اُمتِ مسلمہ کے لیے خصوصی دعا بھی کی گئی۔ مشاعرہ کے بعد پُرتکلف عشائیہ کا اہتمام تھا۔

✦ جشنِ اُردو کا آٹھواں سالانہ مشاعرہ اور کوی سمیلین دسمبر کو الشیخ آڈیٹوریم دبئی یو اے ای میں منعقد ہوا جس کے روحِ رواں سید فرحان واسطی تھے۔ اس مشاعرہ میں پاکستان اور ہندوستان سے نامور شعرائے کرام نے شرکت کی۔

✦ ''تحبیب'' کے عنوان سے اُردو، ہندی، عربی، انگلش اور عالم زبان و ادب کے حوالے سے ادبی فیسٹیول دوبئی میں منعقد ہوا جس کے روحِ رواں اُردو شاعری کا ایک بڑا نام جاوید اختر تھے۔ اہتمام طارق فیضی نے کیا تھا۔ اس فیسٹیول میں پاکستان سے قمر رضا شہزاد، واجد امیر، علی اکبر ناطق، انجیل صحیفہ، سلمان ثروت، عزیز یوسف، ضیا ندکور، مہوش احسن اور جرمنی سے عاطف توقیر امریکہ سے ثروت زہرا، انگلینڈ سے شہباز خواجہ، ہندوستان سے اعجاز شاہین، عمر فاروق، مشتاق احمد اور دوبئی سے عامر حفیظ، علی زیرک، نیلوفر افضل نے شرکت کی۔

✦ علی گڑھ المنائی ایسوسی ایشن مانٹریال۔ کینیڈا کے زیرِ اہتمام ایک خوب صورت بین الاقوامی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں انڈیا، پاکستان اور کینیڈا کے شعراء نے کلام پیش کیا اور سامعین سے بھرپور داد و تحسین وصول کی۔

✦ نامور افسانہ نویس محترمہ ''شہناز شورو'' کے تیسرے افسانوی مجموعے ''کوئی کہکشاں نہیں ہے'' کی تقریبِ رونمائی 15 دسمبر کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ صدارت محمود شام نے کی۔ مہمانانِ خصوصی محترمہ زاہدہ حنا، محترمہ ناز رحمٰن تھیں۔ سید کاشف رضا، اقبال خورشید اور عفت نوید نے اظہارِ خیال کیا۔ نظامت کے فرائض عنبرین حسیب عنبر نے ادا کیے۔

✦ ایران سے تشریف لائے ہوئے اُردو اور فارسی کے ممتاز شاعر احمد شہریار کے اعزاز میں حبیب یونیورسٹی مین مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت جناب انور شعور نے کی۔ نظامت کے فرائض انعام ندیم نے ادا کیے۔ اس مشاعرے میں افضال احمد سیّد، محترمہ فاطمہ حسن، تنویر انجم، عقیل عباس جعفری، ناصرہ زبیری، خالد معین، ڈاکٹر فہیم شناس کاظمی، سحر تاب رومانی، رُخسانہ صبا، عنبرین حسیب عنبر، کاشف حسین غائر، دلاور علی آذر، طلعت منیر، آزاد حسین آزاد، احمد جہانگیر اور اورنگ زیب نے شرکت کی۔

✦ 13 دسمبر کی شام عابد رشید (شکاگو) کے اعزاز میں ادبی تنظیموں ''زاویہ''، شغف اور انتظامیہ ٹی ہاؤس کے زیرِ اہتمام راولپنڈی آرٹس کونسل میں ایک بھرپور

مشاعرہ منعقد کیا گیا۔صدارت نامور شاعر سلیم قریشی نے کی۔مہمانِ خصوصی راحت سرحدی تھے۔ جبکہ نظامت کے فرائض محبوب ظفر نے ادا کیے۔ اس مشاعرہ میں جڑواں شہروں کے نوجوان شعراء نے بھرپور انداز میں شرکت کی اور اپنی تازہ تخلیقات سے محفل کو گرمائے رکھا۔

✦ نامور شاعر ہمایوں پرویز شاہد کی پنجابی نظموں کی کتاب ''چیتر رُت'' کی تقریب رونمائی و مشاعرہ عالمی ادبی تنظیم ''ادارہ خیال وفن لاہور'' کے زیر اہتمام بہ اشتراک اکادمی ادبیات پاکستان اکیڈمی کے دفتر میں 12 دسمبر کو منعقد ہوئی۔صدارت پروفیسر عاشق رحیل (بانی گلشن ادب لاہور) نے کی۔اس تقریب میں کثیر تعداد میں شعراء و شاعرات نے شرکت کی۔ نظامت ممتاز راشد لاہوری نے کی۔

✦ نعت لائبریری شاہدرہ کے زیر اہتمام 84ویں ماہانہ محفل کشور نعت جمال پارک لاہور میں منعقد ہوئی۔اس کا اہتمام نعت لائبریری شاہدرہ نے کیا تھا۔ صدارت پروفیسر محمد عباس مرزا نے کی۔ 2023ء کے دوران باقاعدگی سے محفل میں آنے والے ثنا خوانوں کو اعزازت سے نوازا گیا۔

✦ ادبی تنظیم اسلوب کے زیر اہتمام پنجاب کے معروف شاعر حافظ صادق فدا کے شعری مجموعے واہ کی تقریب پذیرائی و مشاعرہ 17 دسمبر آیان پیلس 793 گلبہار بلاک بحریہ ٹاؤن میں منعقد ہوا۔ صدارت جناب رائے محمد ناصر نے کی۔ مہمانانِ خصوصی محمد عباس مرزا اور اوصاف شیخ جبکہ اظہارِ خیال نوید صادق، سیّد فدا بخاری اور علی احمد گجراتی نے کیا۔ معتبر شعرائے کرام نے تقریب و محفل مشاعرہ میں شرکت کی۔

✦ شعبہ اُردو الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام بین الاقوامی فلسطین کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر جلیل عالی، ڈاکٹر سعادت سعید اور ڈاکٹر انوار احمد نے کی۔ خیر مقدمی کلمات پروفیسر ڈاکٹر شکیل روشن صدر الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے ادا کیے۔اظہارِ خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر نجیب جمال، جناب نصر ملک (ڈنمارک)، جناب محمد حفیظ خان، جناب اشفاق حسین (کینیڈا)، ڈاکٹر آصف زہری (انڈیا)، ڈاکٹر علی کاوسی نژاد (ایران)، ڈاکٹر طارق ہاشمی اور ڈاکٹر اشرف کمال شامل تھے۔یہ کانفرنس فیس بک پر براہِ راست نشر ہوئی۔

✦ شعبہ اُردو مائی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام ''الٰہیات-اسلامی کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر یونی ورسٹی کے آڈیٹوریم میں ایک شاندار ادبی سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کی صدارت معروف شاعر اور ماہر اقبالیات پروفیسر جلیل عالی نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر مقصود جعفری، ڈاکٹر راشد حمید اور پروفیسر ادریس آزاد مہمانِ خصوصی تھے۔معزز مہمانوں کو صدرِ شعبہ ڈاکٹر عارف فرہاد اور پی ایچ ڈی اُردو اسکالرز م۔ن راشد، محمد یوسف، محمد عثمان ارشد نے گلدستے دے کر استقبال کیا۔

✦ ادبی و ثقافتی تنظیم ''زاویہ'' اور زندہ لوگ کے زیر اہتمام اور اکادمی ادبیات پاکستان کے تعاون سے صاحب اسلوب شاعر، ادیب اور نقاد شہزاد اظہر کی نظمیہ تصنیف ''پل کی سلوٹ پہ'' کی تقریب رونمائی و تقسیم کتاب، کانفرنس ہال اکادمی ادبیات اسلام آباد میں منعقد ہوئی۔صدارت پروفیسر جلیل عالی نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر وحید احمد مہمانِ اعزاز ڈاکٹر رفیق سندیلوی تھے۔عرفان احمد عرفی ڈاکٹر سعید احمد، ڈاکٹر روشن ندیم، قاسم یعقوب اور ڈاکٹر مہناز انجم نے اظہار خیال کیا۔

✦ انگریزی اور اُردو زبان کی معروف شاعرہ فرزانہ عاقب کی چھ انگریزی شاعری کی کتابوں کی تقریب رونمائی جم خانہ کلب لاہور میں منعقد ہوئی جس میں ملک کے نامور ادیبوں اور صحافیوں نے شرکت کی اور شاعرہ کی شخصیت اور فن سے متعلق گفتگو کی۔میزبانی کے فرائض سابق ٹیسٹ کرکٹر عاقب جاوید اور جم خانہ کلب کی انتظامیہ نے ادا کیے۔تقریب کے Hi-Tea کا انتظام تھا۔

✦ علمی و ادبی تنظیم قلم قرطاس حویلیاں کے زیر اہتمام شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے حوالے سے ہورائزن ایجوکیشنل اکیڈمی حویلیاں میں 18 نومبر کی شام کو ایک یادگاری تقریب منائی گئی۔ڈاکٹر عادل سعید قریشی نے پرمغز مقالہ پیش کیا۔سہیل صمیم نے نظم پڑھی۔صدرِ محفل پروفیسر شوکت خان نے علامہ کے افکار پر روشنی ڈالی ملک ناصر داؤد، پروفیسر فرحان انجم اور ساجد خان نے علامہ محمد اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی۔اس تقریب میں طلباء نے بھرپور شرکت کی۔

✦ معروف شاعر عبدالوحید بسمل کی رہائش گاہ پر نعتیہ مشاعرہ و محفل میلاد کا اہتمام کیا گیا جس میں علمائے کرام نعت خواں حضرات، ایبٹ آباد، نواں شہر اور حویلیاں کے شعراء کے علاوہ سامعین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

✦ ڈاکٹر اشفاق ناصر کی کتاب ''آخرکار'' کی تقریب رونمائی و آثار ایوارڈ کی تقریب آثار اکیڈمی نے زیر اہتمام فلیٹیز ہوٹل کے ایمرالڈ ہال میں منعقد ہوئی جس کی صدارت معروف شاعر حسنین سحر نے کی۔مہمانِ خصوصی عباس تابش تھے۔اظہارِ خیال کرنے والوں میں امیر جعفری، نوید صادق، حمیدہ شاہین، شکیل جاذب نے اظہارِ خیال کیا۔اس موقع پر ڈاکٹر اشفاق ناصر کی کتاب کو ایک روح آثار ایوارڈ دیا گیا۔تقریب میں لاہور کے ممتاز شاعر و ادیبوں نے شرکت کی۔فیصل عجمی اور شاہد ماکلی میزبان تھے۔

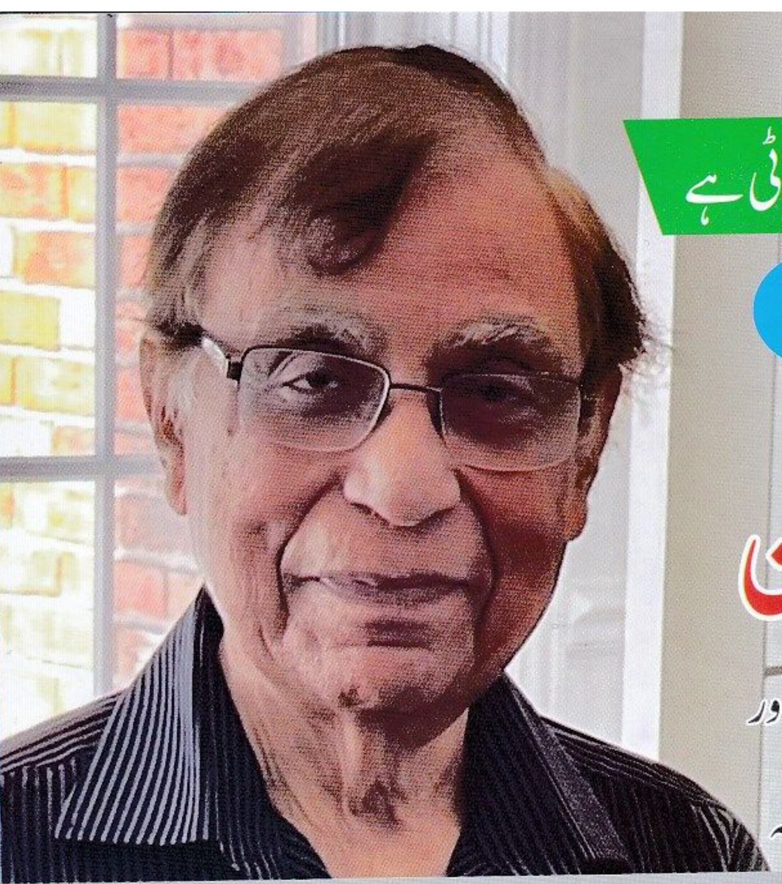

ایک تخلیق کار کا فن کے تئیں اخلاص ہی اس کی کسوٹی ہے

زبان کی اولین شناخت اس کا رسم الخط ہے

ممتاز شاعر

ولی عالم شاہین

سے معروف شاعرہ، کالم نویس اور مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

اداس ہونا غیر فطری نہیں لیکن اداسی اور مایوسی دونوں الگ شے ہیں

س۔ اپنے بچپن اور ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتایئے۔

ج۔ میرا تعلق غازی پور ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع ایک گاؤں سے ہے جہاں کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ گاؤں کے وسط میں ایک مسجد تھی جس کے دروازے کے سامنے ایک کنواں تھا جہاں بطور خاص جمعہ کے دن نہانے والوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ ایک نہایت متقی، نفیس اور شفیق بزرگ مولوی محمد حنیف صاحب مسجد کے امام تھے۔ پورے گاؤں کے علاج معالجے کے لئے حکیم عبدالجلیل صاحب کی خدمات کا سہارا میسر تھا۔ ایک منظر جو آج تک ذہن پر ثبت ہے وہ ہندوؤں کے ایک ماہ پر محیط تہوار "بول بم" سے وابستہ ہے۔ ساون کے

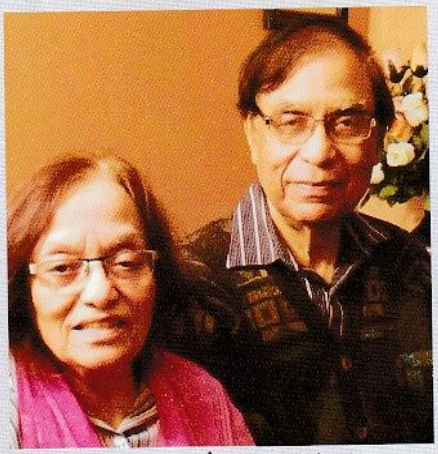

شریکِ حیات روشن کے ساتھ

مہینے میں، اگست ستمبر کے دوران، سلطان گنج میں گنگا ندی سے پانی لے کر زائرین ننگے پاؤں ایک سو پانچ کلومیٹر کا دیوگھر (بابا دھام) تک کا سفر پورے بدن کا سجدہ کرتے ہوئے طے کرتے ہیں تاکہ شو جی کی مورتی پر گنگا جل ڈھال کر اپنے انتہائی جذبۂ عبودیت کا اظہار کر سکیں۔

میر تقی میر کے شعر:

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کی یہ گویا ایک عملی شکل تھی۔ ہمارے آباء واجداد سب اپنے نام کے ساتھ 'سید' یا 'میر' لگاتے تھے۔ میرے والد جن کا نام میر نوید علی تھا اپنے محلے اور اطراف و جوانب میں 'میر صاحب' کہلاتے تھے۔

س۲۔ کچھ یادیں زمانۂ طالب علمی کی بھی قارئین سے شیئر کیجیے۔

ج۔ غازی پور پرائمری اسکول میں چار اساتذہ تھے۔ مولوی اصغر حسین، مولوی عابد حسین، مولوی عبدالرزاق، اور مولوی عبدالشکور۔ اول الذکر ہیڈ ماسٹر تھے۔ عابد حسین صاحب علم الحساب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ سائنس، ریاضیات، اور بعد میں شماریات سے میری دلچسپی (یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا) میں شاید ان کی دی ہوئی بنیادی تربیت کام آئی ہو۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

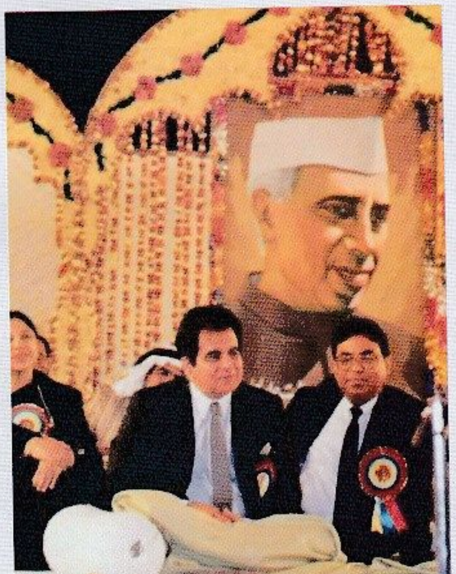

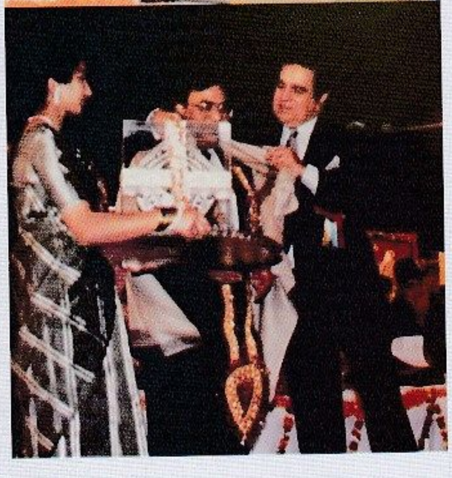

"Sakura & Spice"

A Pakistani's Journey Through Japan

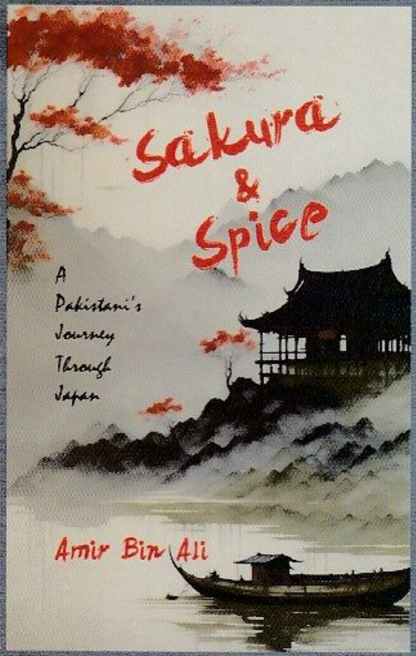

Price
1000
Rupees

FREE
DELIVERY

Renowned Author, Poet & Traveloger

Amir Bin Ali's

New Travelogues is

Out Now

It is be Available on the Racks of
all important Book Stores & E. Commerce Websites

Amir Bin Ali is Residing in Japan from last many years and a frequent international traveler. He is an optimistic writer. It was unearthing for me when Amir Bin Ali mentioned that the national flower of Japan, which is cherry has its origins from the Himalayan mountains near Islamabad in Pakistan.

With the passage of time its growth spread in other parts of India, America, Canada, Korea and Japan. In Japan it is called Sakora in local language. Flowers on the trees appear only during spring and the tradition of watching these flowers is called "Hanami".

Maybe, after reading this book, a few people will decide that we should learn something from Japan to start the journey towards progress.
(Express Tribune Book Review)

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu poetry. He has always been a globetrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search Of New Sights & Experiences. He has Written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books Of Interviews With Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expert in Seven international Languages
(Daily Times Book Review)

YOU CAN ORDER DIRECTLY

Nastalique Publications
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore
+92-300-4489310 - +92-331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com